APRIL
2024

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

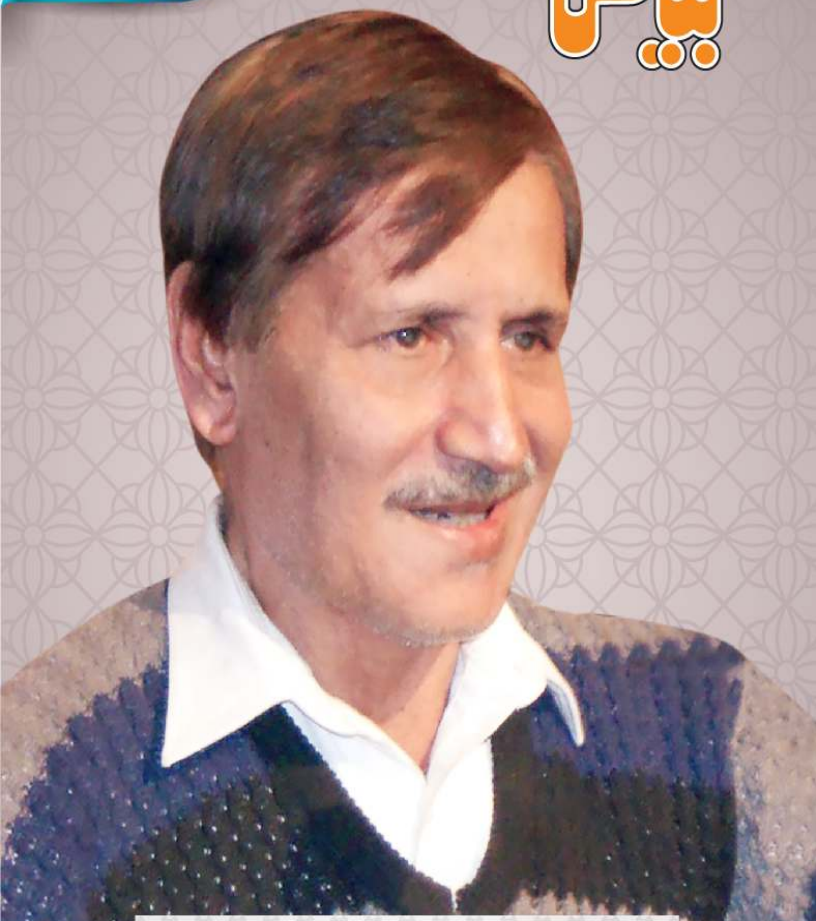

Minhaj University Lahore

تیسری قومی ادبی نعت کانفرنس 2024

ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کے لیے طویل علمی، ادبی، تحقیقی خدمات کے اعتراف میں (لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ)

فروغ نعت ایوارڈ (انٹرنیشنل)

ڈاکٹر ظفر اقبال نوری (امریکہ)

فروغ ادب ایوارڈ (انٹرنیشنل)

تنویر پھول (امریکہ)

فروغ ادب ایوارڈ (انٹرنیشنل)

عرفی ہاشمی (آسٹریلیا)

خدمت نعت ایوارڈ

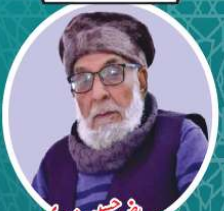

سید ریاض حسین زیدی

نعتیہ تحقیق وتنقید ایوارڈ

ڈاکٹر شبیر احمد قادری

فروغ ادب ایوارڈ

واجد امیر (لاہور)

غزل

کس رخ سے تیری مدح ، ترے مدح جُو کریں
کس تار سے حروف کے دامن رفو کریں

جیبِ جنوں میں اک عمل ، اک تار تک نہیں
کس منہ سے ہم غریب تری آرزو کریں

تاجِ نمود کے لیے سر تن پہ چاہیے
ہم سر بہ جیب کیا ہوسِ رنگ و بو کریں

پرسانِ حال کون ہے ، اپنا ترے سوا
ہم لوگ کس کے نام پہ کسبِ نمود کریں

اے احتیاط ، بات کس انداز سے کہیں
کس طور احتیاج رقم ہو بہو کریں

کس دید کے حریص ہیں اے شہرِ علم ہم
کس دھج سے کیا پکار ترے روبرو کریں

کس رنگ میں رنگیں کہ یہ لب پھول بن سکیں
کس طور کس طریق تری گفتگو کریں

خالد نمازِ مدح ادا ہو تو کس طرح
کس نم مہک سے تیرے ثناگر وضو کریں

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا نقیب

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 32 - اپریل 2024 - شمارہ نمبر: 4

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: جناب گلزار بخاری
عید الفطر مبارک

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور۔ 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر، پبلشر اور پرنٹر نے زریک ایڈورٹائزرز پرنٹرز 16 کلومیٹر ملتان روڈ سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	خاور اعجاز	7
2	نعت	جلیل عالی، نسیم سحر، راحت سرحدی، افروز رضوی، اقبال سروبہ، رضا اللہ حیدر، سرور حسین نقشبندی، شفقت اللہ مشتاق، غلام رسول زاہد	8 تا 16
3	عقیدت	مرزا آصف رسول	17
4	رباعیات	محمد ارشاد	18
5	قطعات	طاہر ناصر علی	19
		مضامین: شائستہ اعوان، منور علی ملک، نسیم سحر، شائستہ اعوان	20 تا 37
6	گوشہ گلزار بخاری	گلزار بخاری ___ مختصر آرا: حسن عسکری کاظمی، خالد علیم، عطاالعزیز	38 تا 39
		گلزار بخاری کی نعت، غزل، نظم	40 تا 47
		گلزار بخاری کی رباعیات	48 تا 49
7	افسانے / ناولٹ	ابدال بیلا، کلیم خارجی، فصیحہ آصف خان، محمد طارق علی، فرخندہ شمیم، وسیم جبران، محمد شفیق	50 تا 80
8	غزلیں	خالد احمد، اعجاز کنور راجہ، نسیم سحر، حسن عسکری کاظمی، سید ریاض حسین زیدی، یعقوب پرواز، خاور اعجاز، حامد یزدانی	81 تا 156

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
8	غزلیں	راحت سرحدی، اقبال سرویہ، مسعود احمد، طالب انصاری محمد انیس انصاری، شاہین عباس، افروز رضوی، افتخار شاہد خالدہ انور، اجمل اعجاز، اعجاز دانش، شوکت محمود شوکت، رخشندہ نوید اکرم ناصر، عقیل رحمانی، احمد جلیل، ضیا المظہری، ثمینہ سیّد انصر حسن، سرور فرحان، عابد معروف مغل، عمران اعوان آفتاب خان، شکیل جاذب، ظہور چوہان، طلعت شبیر ریاض ندیم نیازی، شبہ طراز، عاصم اعجاز، افتخار شوکت، اکرم سحر فارانی مظہر امام، طاہر ناصر علی، رمزی آثم، ارشد محمود ارشد، دانش عزیز نبیل احمد نبیل، فیض رسول فیضان، اصغر علی بلوچ، صغیر احمد صغیر محمود کینی، میتھو محسن، محمد اشفاق بیگ، خالد ندیم شانی، سجاد حسین ساجد ساگر حضور پوری، اکرم جاذب، شبیر نازش، احمد سجاد بابر بشیر احمد حبیب، مستحسن جامی، غنی الرحمٰن انجم، زبیر خیالی، انصر منیر نادیہ سحر، عبدالرؤف زین، حماد ریاض، جیا قریشی، محمد علی ایاز نائیلہ راٹھور، شفقت اللہ مشتاق، محمد نور آسی، امتیاز انجم عابد رضا، عظمیٰ نقوی، عباس ممتاز، نوید صادق، نعمان منظور	81 تا 156
9	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	157 تا 165
10	طنز و مزاح / خاکے	علی حسن اویس	166 تا 168
11	چیستانِ رباعی	محمد ارشاد	169 تا 180
12	مضامین	جمیل یوسف، نسیم سحر، طالب انصاری، جمیل احمد عدیل ثمینہ سیّد، نبیل احمد نبیل، شاہد اشرف، فیصل زمان چشتی راحیلہ خورشید، محمد نوید مرزا، اعجاز رضوی	181 تا 224
13	نظمیں	جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی، صفدر صدیق رضی حامد یزدانی، محمد انیس انصاری، نثار ترابی، فرخندہ شمیم طلعت شبیر، خالد ندیم شانی، امجد بابر، صغیر احمد صغیر، ثمینہ سیّد عاصم بخاری، عظمیٰ نقوی، غلام مرتضیٰ، نائیلہ راٹھور، شائستہ رمضان	225 تا 241

حمد

لبوں پہ رہتی ہیں ہر دم جو مدحتیں اُس کی
شمار کرتے ہیں ہم اِن کو نعمتیں اُس کی

ہمیں نصیب ہے اِک عاجزی، زمانے میں
مکان اُس کا ہے، در اُس کا، دولتیں اُس کی

کتاب، ذاتِ محمدؐ، یہ سانس کی ڈوری
ہم عاصیوں پہ ہیں کیا کیا عنایتیں اُس کی

مکانِ زیست میں ہم اِس طرح سے رہتے ہیں
کہ فرشِ خاک ہمارا ہے اور چھتیں اُس کی

رہِ یقین میں ہم ڈگمگاتے رہتے ہیں
ہمیں سنبھالتی رہتی ہیں رحمتیں اُس کی

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وسعتِ کائناتِ عشق دِکھا
ربِّ قوسین! نقطۂ پرکار

نعتؐ

جادۂ عشق میں تابندہ علم تیرے ہیں
کیا بتائیں ہمیں کیا نقشِ قدم تیرےؐ ہیں

دوسرا کون ہے اس شان کا ممدوح کوئی
وصف جیسے سرِ قرطاس و قلم تیرے ہیں

مالکِ کُل نے کیا والی و مختار تجھے
یہ جہاں تیرا ہے فردوس وارم تیرےؐ ہیں

اک تریؐ دُھن ہے ہمارے لیے آہنگِ حیات
شوق سینے میں بہم آنکھ میں نم تیرےؐ ہیں

دل کسی موسم و ماحول کا محتاج نہیں
ہوں کسی حال میں بھی ہم ہمہ دم تیرےؐ ہیں

کیا مجال آنکھ اٹھے اپنی کسی اور طرف
آخری سانس تلک تیری قسم تیرےؐ ہیں

یاد رکھتی ہے تریؐ کیفِ دگر میں ان کو
شہرِ توفیق میں جو صاحبِ غم تیرےؐ ہیں

تیرے عشاق سے ملتے ہیں تو رشک آتا ہے
صاف دِکھتا ہے کہ ہم تو کہیں کم تیرےؐ ہیں

اپنے اعمال تو ایسے نہیں پھر بھی آقاؐ
تیری نسبت ہے میسر تو کرم تیرےؐ ہیں

جلیل عالی

نعتؐ

اِک نُورِ سرمدی کا حوالہ ہے نعت میں
پھر کیا عجب، جو اِتنا اُجالا ہے نعت میں

جو لفظ بھی لکھے ہیں انہیں زندگی ملی
تکریم و مِدحتِ شہِ والا ہے نعت میں

پھر بھی بیان اُنؐ کا مکمل نہ ہو سکا
ہر حرف نعت ایک مقالہ ہے نعت میں

نِکلے ہیں دائرے سے مفاہیم کس قدر
انوارِ نُو بنے گا جو ہالہ ہے نعت میں

رہنے لگا ہوں قریۂ عشقِ رسولؐ میں
میں نے تو اپنا آپ بھی ڈھالا ہے نعت میں

ان کی عطا سے یہ کبھی خالی نہیں ہوا
لبریز یہ جو عشق پیالہ ہے نعت میں

آمد کی کیفیات بھی شامل ضرور ہیں
مضمون مَیں نے جو بھی نکالا ہے نعت میں

میں ایک ذرّہ ریت کا، صحرا میں گُم کہیں
اور سامنے وہ کوہِ ہمالہ ہے نعت میں!

نسیمِ سحر

نعت ﷺ

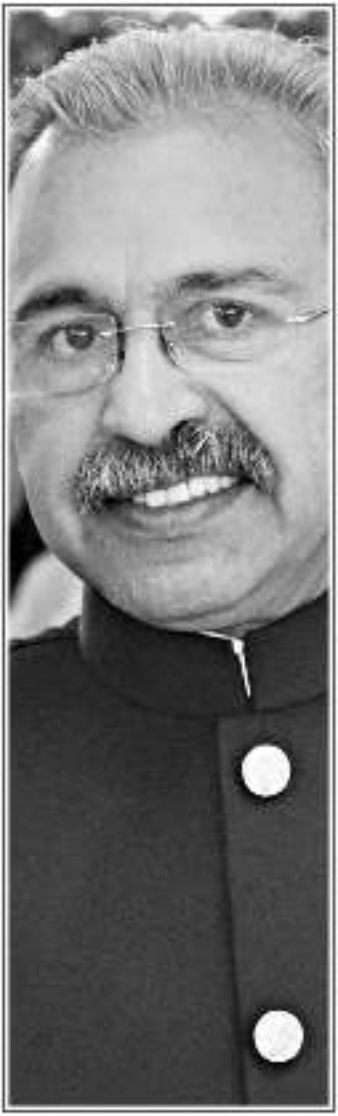

کریں گے جب نظر سرکار میرے
تو ہو جائیں گے بیڑے پار میرے

درودِ پاک کی خوش بو سے پہروں
مہکتے ہیں در و دیوار میرے

یہ شاخوں پر ثنا گستر پرندے
دعائیں مانگتے اشجار میرے

ہیں ان کے نام کی برکت سے اب تک
منور گنبد و مینار میرے

عطا ان کی نہیں تو اور کیا ہے
جو اب تک سر پہ ہے دستار میرے

اگر ان کا کرم مجھ پر نہ ہوتا
تو ملنے تھے کہاں آثار میرے

رضا شامل نہ ہو اُن کی جو راحت
تو میں کیا اور کیا اشعار میرے

راحت سرحدی

نعتؐ

روشنی ہے ضوفشاں چاروں طرف
نورِ رحمت کا جہاں چاروں طرف

سب نبی کی حجوم کر نعتیں پڑھیں
عشق کا ہو گا بیاں چاروں طرف

جگمگا اٹھی ہے طیبہ کی زمیں
نور پھیلا ہے جہاں چاروں طرف

ہے بہت مشکل میں اب تو زندگی
دین کے دشمن یہاں چاروں طرف

آمدِ احمد کی جب آئی خبر
"ہے فضا میں کہکشاں چاروں طرف"

ہے یہی افروز میری آرزو
حق کی ہو بس داستاں چاروں طرف

افروز رضوی

نعتؐ

ہے باعثِ سکون اطاعت رسولؐ کی
دل پر ہے میرے نقش محبت رسولؐ کی

آوازِ حق بلائے تو قربانیاں بھی دو
کہتی ہے بار بار یہ الفت رسولؐ کی

ہیں مطمئن جو کفر کے باطل نظام سے
اُن کو کہاں نصیب شفاعت رسول کی

اس کے سوا نہیں ہے کوئی ظلم کا علاج
نافذ کرو جہاں میں شریعت رسولؐ کی

فیضِ نبی سے خاک کے ذرے تھے آفتاب
اک شانِ امتیاز تھی سنگت رسولؐ کی

روشن رہے گا محسنِ انسانیت کا نام
اول سے تا ابد ہے رسالت رسولؐ کی

جس طرح ظلمتوں میں درخشاں ہوں مشعلیں
روشن ہے ایک ایک روایت رسولؐ کی

اقبال کو ہے فخر کہا امتی مجھے
بے شک ہے دو جہاں میں قیادت رسولؐ کی

اقبال سروبہ

نعتؐ

قسم خدا کی وہ حسن و جمال دلکش ہے
نبی کے روضے کا منظر کمال دلکش ہے

رسول اعظم و آخر کا خُلق قرآں ہے
ہماری ماں نے جو دی ہے مثال دلکش ہے

وہ جس کو سُن کے ملائک بھی وجد کرتے تھے
وہی اذان میں طرزِ بلال دلکش ہے

گرے گا اب درِ خیبر بھی اور مرحب بھی
خُدا کے شیر علی کا جلال دلکش ہے

ربیعہ مانگ رہے ہیں ہے حضور کی سنگت
جواب اچھوں سے اچھا سوال دلکش ہے

طریقِ ہجرتِ نبوی پہ چل کے جاؤں گا
محال ہو تو ہو لیکن خیال دلکش ہے

بھرے گا چوکڑیاں جا کے دشتِ طیبہ میں
مری تمنا کا شائق غزال دلکش ہے

درود پاک سے دل میں رضا اجالے ہیں
نئے افق پہ منور ہلال دلکش ہے

رضا اللہ حیدر

نعتؐ

جاں کو ہر دکھ کی ہر اک غم کی دوا ملتی ہے
جب گلے آ کے مدینے کی ہوا ملتی ہے

موسم ایسا کہ گھلی جاتی ہے شبنم دل میں
خاک ایسی جسے چھولیں تو شفا ملتی ہے

نعت پڑھتے ہوئے سرشار ہوا جاتا ہوں
میری نسبت لبِ حسان سے جا ملتی ہے

آپ کی مدح کا ہوتا ہے وہاں سے آغاز
سرحدِ عقل جہاں عشق سے آ ملتی ہے

ہم بھلا کیسے نہ اس ذکر سے وابستہ رہیں
یاد سے جن کی ہمیں یادِ خدا ملتی ہے

ایک درویش نے سرور یہ بتایا ہے مجھے
عشقِ احمد میں فنا ہوں تو بقا ملتی ہے

سرور حسین نقشبندی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

حُسنِ آخر نے کیا حُسن کو آخر تجھ پر
آخری روپ دیا ، آخری سُورت لکھی

نعتؐ

حاصل ہے مجھے نسبتِ سرکارؐ مدینہ
اللہ رے یہ شفقتِ سرکارؐ مدینہ

بیٹھا ہوں یہی سوچ کے اس در پہ کہ اک دن
وا ہو گا درِ دولتِ سرکارؐ مدینہ

والشمس کا پرتو رُخِ سلطانِ دو عالم
والفجر کی ضو صورتِ سرکارؐ مدینہ

یہ اُن کی عنایت ہے نوازش ہے وگرنہ
میں اور کہاں مدحتِ سرکارؐ مدینہ

ہے مہر و وفا ، صبر و رضا ، ذوقِ قناعت
فیضانِ درِ عترتِ سرکارؐ مدینہ

یہ مادرِ مشفق کی دعاؤں کا اثر ہے
شفقت پہ جو ہے شفقتِ سرکارؐ مدینہ

شفقت اللہ مشتاق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تیرے اوصاف فقط تجھ سے بیاں ہوتے ہیں
نعت خود لکھی ، بہ پیرایۂ سیرت لکھی

نعتؐ

محبتوں کا اُجالا اگر کہیں پر ہے
چراغ اُس کا مدینے کی سرزمیں پر ہے

فروغِ فصلِ بہاراں اسی چمن سے ہے
نزولِ بارشِ ابرِ کرم یہیں پر ہے

مرے لیے وہ کفِ دستِ مہرباں ہے بہت
کہ لمس جس کا ازل سے مری جبیں پر ہے

ادائے بارِ امانت کے بعد بھی اب تک
ہزار کوہِ گراں شانۂ امیں پر ہے

غلامیٔ شہِ بطحا مرا تعارف ہے
کرم یہ کتنا بڑا مجھ سے کمتریں پر ہے

غلام رسول زاہد

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

لکھتے ہی اُنؐ کا اِسم مُبیںؐ جھلملا اُٹھیں
عرشِ وَرق پہ کاہ کشانِ سخن تمام

العروۃ الوثقیٰ

کمالِ شعر و سخن ہے ثنا محمدؐ کی
یہ ضو ہے صل وسلم علی محمدؐ کی

رہا خلیل کے لب پر جو ربنا وابعث
ہے وہ تتمۂ کعبہ دعا محمدؐ کی

نزاعِ نور و بشر کا جہان کیا جانے؟
کہ شانیں اس سے بھی اونچی ہیں کیا محمدؐ کی؟

خدا کا فیصلہ لا ترفعوا ابد تک ہے
کہ ہے ہر آیتِ قرآں صدا محمدؐ کی

بچے گا گردشِ دوراں کی ظلمتوں سے وہی
ہے جس کا عروۂ وثقیٰ ضیا محمدؐ کی

وہ نعرہ ہے اسی جرأت کا آج پھر داعی
ندا تھی جیسی یمامہ میں "یا محمدؐ" کی

ہے فرض و واجب و نفل اور بحثِ دیں ورنہ
ہے جانِ عشق و وفا ہر ادا محمدؐ کی

الستُ سے جو کھلے ہیں بربکم کے چمن
ہے سب میں نکہتِ قالوا بلیٰ محمدؐ کی

نہیں مسیح کا بس حرفِ اسمہ احمدؐ
نوید لائے ہیں سب انبیا محمدؐ کی

خلیفہ اس لیے رب نے بنایا آدم کو
کہ ہے ریاستِ ارض و سما محمدؐ کی

کمالِ خیر کا معیار بھی محمدؐ ہیں
متاعِ علم بھی ہے حق رسا محمدؐ کی

ہے اُن سے عشق چراغاں تلک ہی کیوں آصف!
عمل میں بھی ہو منور وفا محمدؐ کی

مرزا آصف رسول

رباعیات

بہتی پوشاک بہتی چھوڑے گی کیا
یا اپنی طرف لپک کے موڑے گی کیا
قابض ہیں گھاٹ پر اُٹھائی گیرے
ننگی دھوئے گی کیا نچوڑے گی کیا

.....

اے زاہدِ گوشہ گیرہاں اے مزدور
اللہ سے لو اور اس کے بندوں سے نفور
کیا مُزدِ عبادات یہی ہے کہ ملے
دنیا میں پری وگرنہ جنت میں حور

.....

اے تُو کہ تری معاش ہے طُرفہِ معاش
گُم ڈھیر میں بھُس کے ایک تخمِ خشخاش
مت ڈھونڈ خدا کو لامکانی ہے خدا
گُم تُو ہے خدا نہیں ہے کر خود کو تلاش

.....

ہوتی ہے کامیاب اس دم تدبیر
تدبیر کی جب کرے اعانت تقدیر
ہو جائے خطا تو تیر بھی تکا ہے
لگ جائے ہدف پہ جب تو تکا بھی ہے تیر

اگلوں کا سا رہا نہ پچھلوں کا مزاج
پچھلوں نے بُھلا دیئے ہیں اگلوں کے رواج
مطلب دونوں کا ایک ہے یا نہیں ایک
کہیے کہ نہ کہیے آج کل کو کل آج

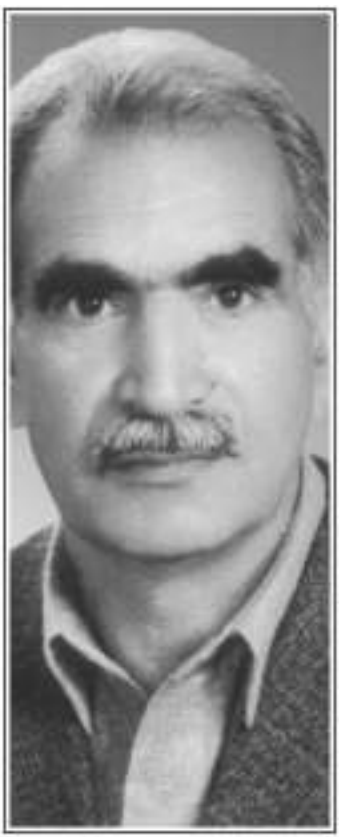

محمد ارشاد

قطعات

وقت کا سیلِ رواں سب کچھ بہا کر لے گیا
منظروں کے دھندلے دھندلے عکس پھیلے رہ گئے
جن حسیں یادوں کے ہم راہ ہم پڑھے اسکول میں
صرف اُنکے نام لوحِ دل پہ لکھے رہ گئے

.....

جاتے جاتے کر گیا یہ جور سال
زندگی کا کم ہوا اک اور سال
کمسنی کا حُسن ارمانِ شباب
لے گیا ہے ساتھ کتنے دور سال

.....

خواب ہو جائیں گی ساری زندگی کی رونقیں
حسرتیں دل کی سبھی دل میں دھری رہ جائیں گی
صرف اپنے گھر میں اک ہم ہی نہیں ہوں گے مگر
ایک الماری میں سب چیزیں سجی رہ جائیں گی

.....

کیونکر نہ بُھلا دیں اسے آئندہ کی نسلیں
وہ شخص جو ورثے کی حفاظت نہیں کرتا
اب ہو گئیں جذبوں میں بھی خود غرضیاں شامل
اب کوئی کسی سے بھی محبت نہیں کرتا

.....

آج تنہا ہیں کوئی ساتھ نہیں
کل تھے ہمراہ کیسے کیسے لوگ
چھین کر لے گئی اجل کیسے
باغِ دنیا سے پھول جیسے لوگ

چار سو ہیں بناوٹی رشتے
جن میں گھٹتا ہے رہ کے دم میرا
کام نبٹا رہا ہوں سب اپنے
وقت اب رہ گیا ہے کم میرا

.....

جو بھی اُن سے سوال کرتا ہے
وہ اُسے لاجواب کرتے ہیں
نیند آتی نہیں تو پھر طاہر
گر یہ اَن دیکھے خواب کرتے ہیں

طاہر ناصر علی

گلزار بخاری

گلزار بخاری کا اصل نام گلزار حسین شاہ ہے۔ والد کا نام سید امیر محمد شاہ اور دادا کا نام لال شاہ ہے۔ وہ 11 مارچ 1949 کو دریائے سندھ کے کنارے ایک دور افتادہ گاؤں نورنگہ میں سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ سات بھائی تھے اور پانچ بہنیں ہیں۔ بہن بھائیوں میں گلزار سب سے بڑے ہیں۔

ابتدائی تعلیم نورنگہ سکول میں حاصل کی۔ ابتدا میں جس طرح بچے رویا کرتے ہیں وہ بھی اسی طرح ہی کرتے تھے اور سکول سے بھاگ کر گھر آجایا کرتے تھے، مگر پانچویں میں آتے ہی ان کے مزاج میں تبدیل آئی اور وہ پڑھائی کی طرف مائل ہوئے یہ تبدیلی ان کے سکول کے ایک استاد سید عطا محمد شاہ کی وجہ سے تھی۔ عطا محمد نے ان کو پانچویں کے امتحان کی اتنی اچھی تیاری کروائی کہ انھوں نے پانچویں کے وظیفے کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ نورنگہ میں صرف پرائمری تک کے لیے سکول تھا اس لیے چھٹی جماعت کے لیے ان کے نام کا صرف اندراج روکھڑی مڈل سکول میں کروایا گیا اور دور ہونے کی وجہ سے چھٹی جماعت کی تعلیم کی تمام تر ذمہ داری گھر پر ہی ان کے استاد عطا محمد شاہ کو سونپی گئی۔ جب وہ ساتویں میں تھے تو نورنگہ مڈل سکول بن گیا۔ آٹھویں کا امتحان نورنگہ سے پاس کیا اور 775 میں سے 704 نمبر لے کر تو گلزار نے ضلع بھر میں ٹاپ کیا۔ 1965 میں میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول موچھ سے کیا۔ 1966 میں فارسی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ کالج میں داخلہ لینا چاہتے تھے مگر والد کے کہنے پر کہ کالج کے اخراجات کی وجہ سے چھوٹے بھائیوں کی تعلیم کے خرچ پورے نہ ہو سکیں گے۔ لہٰذا 67 میں کمالیہ سے ورینکلر ٹیچر کا کورس کیا اور 1968 میں ایف اے اور 1970 میں بی اے کے امتحانات پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے پاس کیے۔ 1972 میں ایجوکیشن کالج میں بی ایڈ کے لیے لاہور آئے یہاں اپنے چھوٹے بھائی کے ہاں رہائش اختیار کی جو یہاں ملازمت کرتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے 73-1972 میں پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایم اے پنجابی کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ یونیورسٹی کی طرف سے یہ ایم اے پنجابی کا پہلا امتحان تھا۔

1968 میں انھوں نے ملازمت کا آغاز کیا اور گورنمنٹ ہائی سکول داؤد خیل میں مدرس مقرر ہوئے۔ 1974 میں وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پنجابی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ 1978 تک یہیں تقرر رہا۔ 78ء کے بعد مرے کالج سیالکوٹ تبادلہ ہوا۔ پھر واں سے ٹرانسفر ہو کر 1988 گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور آئے۔ اس کالج میں وہ بطور اسسٹنٹ پروفیسر ترقی پا کر آئے تھے۔ 1999 میں ایسوسی ایٹ پروفیسر بنے۔ بعد ازاں بطور پرنسپل ترقی پا کر گورنمنٹ کالج جنڈیالہ شیر خان شیخوپورہ چلے گئے اور وہاں سے 2009 میں ریٹائرڈ ہوئے۔

☆☆☆☆☆

سید گلزار بخاری کی نعت نگاری: فکری وفنی جائزہ

شائستہ اعوان

اُردو کی نعتیہ شاعری میں قیامِ پاکستان کے بعد بعض شعرا نے اُن نعتیہ موضوعات اور اسالیب کو دلچسپی سے قبول کیا، جو نعت کی روایت کے بعد حالی اور اقبال کی جدت پسندی سے جُڑے ہوئے تھے اور پھر جنھیں جدید نظم نگاروں نے مزید آگے بڑھایا۔ انھی شاعروں میں ایک اہم اور نمایاں نام گلزار بخاری کا ہے۔

گلزار بخاری کا شعری سفر نصف صدی پر محیط ہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے نعت، غزل، رباعی اور قطعہ میں خاص طور پر طبع آزمائی کی اور اپنی تخلیقی قوت سے نہایت عمدہ شاعری کی۔ تاہم ان کے شعری مجموعوں کی طباعت کا آغاز بہت تاخیر سے ہوا، بل کہ بہت ہی تاخیر سے ہوا۔ ایک ایسا شاعر، جس نے زندگی میں بہت لکھا اور بھرپور لکھا، لیکن ان کی شاعری کا مجموعی مطالعہ اس وقت میسر آیا، جب ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''ہوا پتے گرائے گی'' 2013 میں منصۂ شہود پر آیا۔ اس مجموعے کا آغاز بھی حمد، نعت اور سلام سے ہوا، اس مجموعے میں شامل ان کی نعت بھی ان کی وارفتگی اور عشقِ رسولؐ کا والہانہ اظہار ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دھوپ درپے رہی سورج کے جہاں میں آکر
امن پایا ترے سائے کی اماں میں آکر

تیری رحمت پہ یقیں نے سفر آسان کیا
ذہن بھٹکا نہ کبھی دشتِ گماں میں آکر
تیرے گلزار سے جاتی ہی نہیں فصلِ بہار
گرچہ ہر باغ رہا دامِ خزاں میں آکر

.....

نعت میں جدت اور ندرت کا انداز گلزار بخاری کی نعتیہ شاعری میں شروع ہی سے موجود رہا، جس کا کامل اظہار ہمیں ان کے نعتیہ مجموعے ''صدائے کن فیکون'' میں ملتا ہے۔ اس مجموعے کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ان کی پرانی اور نئی نعتوں کا اسلوب قریب قریب ایک سا ہے۔ چوں کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں اور حب رسولؐ و اہلِ بیت ان کی شاعری کا ایک خاص وصف رہا ہے، لہٰذا ان کی نعتوں میں ایک خاص کیفیت دکھائی دیتی ہے، جو پڑھنے والے کو سرشار کر دیتی ہے۔

گلزار بخاری نے اپنے مجموعہ ''صدائے کن فیکون'' میں اپنے روحانی جذبوں کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ ان کے لہجے روحانی عقیدت، جذباتیت، گہری فکر اور عقیدت اور انسیت کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ اس نعتیہ مجموعہ کے ابتدا

میں ''اسمِ محمدؐ'' کے عنوان سے نعتیہ قصیدہ شامل کیا گیا ہے۔ جس میں گلزار بخاری نے آپؐ کی سیرت نگاری کو موضوع بنایا ہے۔ آپؐ کی حیات مبارکہ اکائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چند کھجوریں، جو کی روٹی، ایک پیالہ پانی کا
طور طریقے درویشی کے، منصب ہے سلطانی کا

مسند، منبر، حویلی ہیچ ہے اُن کی نظروں میں
دیا چٹائی پر ہے روشن، تہذیبِ عمرانی کا

خدمت گاروں کا لشکر ہے اور نہ فوج کنیزوں کی
سیدِ بطحا کا حجرہ ہے یا مسکن حیرانی کا

بھٹکی ہوئی بھیڑوں کو لانا رستے پر کچھ سہل نہیں
سب کو خبر ہے کتنا مشکل کام ہے گلہ بانی کا

.....

اس قصیدہ میں گلزار بخاری نے آپؐ کی سیرت مبارک کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور آپؐ کی مدح سرائی کرنے والوں کو بھی خراج تحسین پیش کیا ہے۔ سعدیؒ، قدسیؒ، جامیؒ اور حسانؓ بن ثابت ثنا خوانوں کی نعت گوئی کو بھی اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے اشعار ملاحظہ ہوں:

میری کیا اوقات کہ ان کی مدح و ثنا سے قاصر ہے
فن سعدی قدسی جامی کا، انوری و خاقانی

بوصیری جیسی خوش بختی، کعب کی ہمت چاہتا ہوں
صرف نہیں قادر سے طالب توفیقِ حسانی کا

.....

حالی اور شبلی نعمانی کی نعت گوئی کی روایت علامہ اقبال کے ہاں بلندیوں کو چھو لیتی ہے۔ شاعر مشرق علامہ محمد اقبال شاعری اسلامی نظریات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں اسلامی تعلیمات کی ترجمانی کی ہے۔ اقبالؒ نے آنحضورؐ عقیدت و مدحت سے لبریز ہو کر نعت گوئی کی ہے۔ گلزار بخاری نے قصیدہ ''اسمِ محمدؐ'' میں دیگر نعت خوانوں کی طرح اقبال و شبلی کے ناموں کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

شاعرِ مشرق نے پایا ہے سب کچھ ان کی مدحت سے
اس کی سوچ آئینہ ٹھہری افکارِ حقانی کا

الفاروق سے شعرِ عجم تک اس نے کتنے کام کیے
لیکن سیرتِ پاک سے ہے شہرہ شبلی نعمانی کا

.....

حضرت ابو طالب کے متعلق مختلف مکاتب فکر کے ہاں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ وہ آپؐ کے چچا تھے اور عمر بھر وفا کی تصویر بنے رہے۔ یہاں تک کہ شعب ابی طالب کے مشکل ترین سال بھی انھوں نے حضورؐ کے ساتھ گزارے، مگر آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس حوالے سے گلزار بخاری حیرت زدہ دکھائی دیتے ہیں ابو طالب نے آپؐ کی مدحت میں نعت کہی، نہ جانے کیوں اُن کے حوالے سے ایک اختلاف رائے موجود ہے۔

نعت ابو طالب نے لکھی پہلے لیکن حیرت ہے
لوگ اسے کہتے ہیں منکر توحیدِ ربانی کا

.....

گلزار بخاری نے قصیدہ ''اسمِ محمدؐ'' میں آپؐ کی

سیرت، مدحت اور اسوۂ حسنہ کو بیان کیا ہے۔ آپؐ کی تعلیمات، معمولات زندگی اور غزوات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ یہ قصیدہ گلزار بخاری کی عمدہ فکری اور فنی صلاحیتوں کی عمدہ مثال ہے۔ یہ قصیدہ 53 اشعار پر مشتمل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا کیا اس نے جال نہ پھینکے بدر و احد میں، خندق میں
جکڑ نہ پایا ان کو پھندا ابو جہل، سفیانی کا

شاہ عرب کی بود و باش تھی معمولی سے حجرے میں
تھا حیرت افزا ڈیرا بھی اس عہدِ لاثانی کا

اسماعیل کی گردن جھکنے سے شبیر کے مقتل تک
ابراہیم کی آل کا ورثہ جذبہ ہے قربانی کا

غار نشینی سے طائف تک کیسے کیسے موڑ آئے
پیکرِ رحمت سے نہیں چھوٹا جادہ فیض رسانی کا

الہامی باتیں کرتے ہیں شاعر بھی، پیغمبر بھی
لقب انھیں گلزار ہے زیبا تلمیذِ رحمانی کا

....

گلزار بخاری کی نعت گوئی کی بنیاد علم و عرفان پر استوار ہے۔ انھوں نے نعت گوئی میں آنحضورؐ کی تعریف و توصیف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ آپؐ کی سیرت مبارکہ کو بھی بیان کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ گلزار بخاری کا نعتیہ مجموعہ ''کن فیکون'' منظوم سیرت نگاری ہے۔ انھوں نے اپنی نعتوں میں آپؐ کی حیات مبارکہ سے جڑے تمام واقعات کو شعری قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ہاں آپؐ کے اسوۂ حسنہ کے مثالیں بھی موجود ہیں اور آپؐ کی ذات بابرکات سے متعلق معجزات بھی۔

انھوں نے تاریخی اسلامی واقعات کو نعت گوئی کا حصہ بنایا ہے۔ اس طرح قاری اُن کی نعتیں پڑھ کر نہ صرف آپؐ سے عشق و عقیدت کے جذبات کو محسوس کرتا ہے کہ بلکہ آپؐ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے بھی روشناس ہوتا ہے۔ تاریخی مذہبی حالات و واقعات سے آگہی گلزار بخاری کے نعتیہ مجموعہ کا اضافی وصف ہے۔ اُن کے ہاں روضۂ رسول پر حاضری دینے کی حسرت بھی ہے اور وہ مدینہ کی گلیوں کی معطر فضا کو محسوس کرنے کی آرزو بھی۔ اُن کی نعت میں اگرچہ حضورؐ کی شانِ محبوبی کے حوالے سے بھی اشعار موجود ہیں، لیکن ان کی نعتیہ شاعری کا غالب حصہ رسالت مآبؐ کی سیرت پاک کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہے، انھوں نے کمال مہارت سے آپؐ کے اوصافِ حمیدہ کو بیان کیا ہے۔ اسی طرح وہ دربارِ رسالت میں التجا کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ہر اُمتی کا آخری سہارا نبیؐ کریم کی ذات پاک ہے، مگر ایک شاعر کے طور پر گلزار بخاری جس طرح درِ رسولؐ سے گدائی کے طالب دکھائی دیتے ہیں، اُن کا انداز ہی الگ ہے۔ یہی تو جدید نعت کا وصف ہے کہ ان میں حضورؐ کی شانِ محبوبی سے زیادہ سیرت نگاری اور استغاثہ کا رنگ ہے اور گلزار بخاری نے اس انداز کو اپنی تخلیقی شخصیت کا حصہ بنالیا ہے۔

☆☆☆☆☆

گلزار بخاری ___ فن و شخصیت

شعر و سخن کی وادی میں گلزار بخاری اور میں ایک ساتھ وارد ہوئے۔

دسمبر 1972 میں محترم انجم جعفری نے دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر واقع ماڑی انڈس سکول میں ایک شاندار مشاعرے کا اہتمام کیا۔ صدارت میرے ماموں ملک منظور حسین منظور نے کی۔ مہمانانِ خصوصی پروفیسر سید محمد عالم اور علامہ انوار ظہوری تھے۔ ضلع میانوالی کے شعرا کا ایسا مکمل اجتماع پھر کبھی دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

مشاعرے میں سب شعرا نے اپنی شاہکار شاعری پیش کر کے خُوب داد سمیٹی۔ مگر یہ مشاعرہ دو مترجم نوجوان شاعروں نے لُوٹ لیا۔ اُن میں ایک گلزار بخاری تھے، اور ایک میں ___ ہم دونوں کا یہ پہلا مشاعرہ تھا۔ گلزار کی غزل کا یہ شعر حاصل مشاعرہ قرار پایا:

میں سیپ ہوں، مرا حاصل ہے پرورش ان کی
خدا نصیب کرے تجھ کو یہ گُہر میرے

.....

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ گلزار نے اس شعر کا مصرعِ ثانی یوں پڑھا تھا:

خُدا نصیب کرے آپ کو گُہر میرے

.....

بعد میں اس میں ترمیم کر کے یہ شعر کسی خوش نصیب فردِ واحد کے نام کر دیا۔

میری غزل کا مطلع:

متاعِ درد مبارک ہو میرے سینے کو
بلا سے زہر ہے کچھ تو ملا ہے پینے کو

بھی بہت پسند کیا گیا:

اس مشاعرے کے بعد یہ فقیر تو میانوالی ہی میں گوشہ نشین ہو گیا، مگر گلزار اپنی فتوحات کا دائرہ بڑھاتے چلے گئے۔ بھکر اور جھنگ فتح ہوئے، سرگودھا تسخیر ہوا، اور پھر یہ لاہور جا پہنچے۔ وہاں سے ملتان، بہاول پور اور پتہ نہیں کہاں کہاں اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑتے پھرے، مگر مستقل پایۂ تخت لاہور ہی کو بنا لیا۔ ملازمت کی بیڑی پاؤں میں نہ ہوتی تو نہ جانے آج کہاں ہوتے۔

ہجرت ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے۔ شاید اس لیے کہ ہجرت اہلِ نورنگہ کا مقدر تھی۔ آہ! دریا کے ہاتھوں بار بار اُجڑتے اُجڑتے یہ مردم خیز بستی بالآخر معدوم ہو گئی۔ گلزار کا خاندان روکھڑی کے قریب منتقل ہو گیا۔ بقیہ لوگ بھی جہاں جس کو جگہ ملی وہیں بس گیا۔

نورنگہ علم و ادب کا سرچشمہ تھا۔ علم کے میدان میں نورنگہ کے طلبہ ضلع میانوالی میں ہمیشہ ہر سطح پر سرفہرست رہے۔ ادب میں چاروں بخاری برادران (گلزار، علی اعظم، طاہر اور فیروز) اور

منور علی ملک

ان کے کزن ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر ستار سید ملک بھر میں معروف ہوئے۔
نورنگہ کو یہ فضیلت اس لیے نصیب ہوئی کہ سیالکوٹ کی طرح یہاں بھی ایک مولوی میر حسن ہُوا کرتے تھے۔ سید عطا محمد شاہ میرے بہت محترم اور مہربان دوست تھے۔ وہ نورنگہ مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ میں نے ایسا Dedicated اُستاد آج تک نہیں دیکھا۔
نورنگہ میں علم و ادب کے چراغ اسی مرد درویش نے روشن کیے۔ جب ہجرت واجب ہوگئی تو شاہ صاحب نورنگہ سے داؤد خیل کے قریب سادات کی بستی پکی شاہ مردان منتقل ہو گئے۔ یہاں اپنا ایک پرائیویٹ سکول بنا کر تادمِ آخر علم کا نُور بانٹتے رہے۔
گلزار کی شاعری میں ہجرت کا ذکر مختلف زاویوں سے ہوتا نظر آتا ہے۔ یہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

تیری خواہش سے ملی خانہ بدوشی ہم کو
گھر سے نکلے تو نہ پھر خود کو مکاں میں دیکھا

.....

گلزار کی ہجرت کا المیہ یہ ہے کہ پیچھے کچھ رہا ہی نہیں۔ نہ وہ گھر، نہ وہ لوگ، نہ وہ گلیاں، کچھ بھی تو باقی نہیں بچا۔ اسی لیے وہ بڑی حسرت سے یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ:

تم گلزار کہاں جاؤ گے؟
لوگ تو اپنے گھر جاتے ہیں

.....

علامہ اقبال نے داغ کے بارے میں کہا تھا:

آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

.....

گلزار کی نظر بھی بار بار نشیمن کی جانب جاتی ہے، مگر ہاں تو اب گھر کی جگہ دریا ہے، کچھ بے خانماں پرندے دریا کا رُخ بدلنے کی خوش فہمی میں مبتلا ہر وقت وہاں منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ پاگل ہوا کی نوحہ گری کے سوا کوئی مانوس آواز بھی اُدھر سے آتی سنائی نہیں دیتی۔
جب تک اُجڑی بستی کے کچھ آثار باقی رہے گلزار یہ کہتا رہا:

ابھی تک اس کے باشندے سفر سے کیوں نہیں لوٹے
مرے پیشِ نظر یہ قریۂ ویران کیسا ہے؟

.....

مگر اب تو قریۂ ویران کا نام و نشاں تک باقی نہیں رہا ___
ہجرت کے دکھ کا مداوا گلزار کو بالآخر امام عالی مقام جناب حسینؑ کے طرزِ عمل سے ملتا ہے:

کچھ بھی جذبات ہوں بندوں کے مگر ہجرت میں
لوٹنا عار ہے چھوڑے ہوئے گھر کی جانب

.....

اب مسافرت نام ہے نئے جہانوں کی جستجو کا۔ سو گلزار اب یہ کہتا ہے:

ہر دم نئی تلاش ہے، ہر پل سفر میں ہے
ہم ہوں نہ ہوں، شعور مسلسل سفر میں ہے

.....

شجرِ گلزار کی شاعری میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا Image ہے۔ یہ کہیں تشبیہ کے روپ میں نظر آتا ہے، کہیں استعارہ ہے اور کہیں

علامت۔ کہیں یہ فرد کی نمائندگی کرتا ہے کہیں قوم کی اور کہیں یہ وطن کی علامت ہے۔
یوں تو گلزار کی تقریباً ہر غزل میں کسی نہ کسی حوالے سے شجر کا ذکر ہے، مگر یہ چند اشعار خاص طور پر بہت کچھ کہتے سنائی دیتے ہیں:

شجر بے دست و پا ہیں ابتلا کو کون روکے گا
ہوا پتے گرائے گی، ہوا کو کون روکے گا؟

.....

کوئی پتا بھی رفاقت میں نہ پورا اترا
پیڑ پت جھڑ کی ستم گاہ میں تنہا اترا

سروں سے سائے ہٹتے جا رہے ہیں
شجر صحنوں سے کٹتے جا رہے ہیں

.....

اور پھر شجر ہی کے حوالے سے ایک مکمل نظم بھی اس مجموعے میں شامل ہے۔ اس کا عنوان ہے "پیڑوں سے دوستی"
اس نظم کے آخری اشعار دیکھیے:

اس جہاں میں فریب و ریب سے دُور
اک فضا ہے خلوص کی، جس میں
سبزہ و برگ و گل کی نعمت ہے
قلب و جاں کو سرور ملتا ہے
دُھوپ سہہ کر بھی سائبانی کا
زندگی کو شعور ملتا ہے
آؤ پیڑوں سے دوستی کر لیں

.....

گلزار روایت کی پیروی میں صرف غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی باتیں ہی نہیں کرتا بلکہ اس سے آگے کی باتیں بھی کرتا ہے۔ اس کی کچھ چونکا دینے والی باتیں بلاتبصرہ ملاحظہ کیجیے:

اتنا تو ہے طے، خدا نہیں میں
اور اس کے علاوہ کیا نہیں میں؟

بھٹک کے راہ پہ آنے کا ہے مزا اپنا
عجیب لطف حقیقت میں ہے سراب کے بعد

جن کے بس میں نہیں طوفاں کا مداوا گلزار
شہر والوں کو خبر تو کر سکتے ہیں

جانے والوں کی کمی پوری کبھی ہوتی نہیں
آنے والے آئیں گے لیکن خلا رہ جائے گا

کہیں بھی ہو کوئی انساں، عزیز ہے میرا
تمام دہر میں پھیلے ہیں اقربا میرے

مشکل میں نہیں صرف سفر کاٹنے والے
سائے سے گئے خود بھی شجر کاٹنے والے

.....

اس مجموعے میں گلزار کی شاہکار تخلیق وہ غزل نما نظم ہے جو گلزار نے اپنے والدِ محترم کی وفات پر لکھی۔ اس نظم میں احساس کی لَو اتنی تیز ہے کہ اس کی تپش پڑھنے والے کو بھی صاف محسوس ہوتی ہے۔ یہ اس کیفیت میں لکھی گئی ہے جب نہ سر پہ آسمان نظر آتا ہے، نہ پاؤں تلے زمین۔ خاص طور پر اس کا یہ آخری شعر قیامت ہے اُن لوگوں کے لیے جن کا کوئی جواں سال عزیز اس دنیا سے اچانک رُخصت ہو جائے:

شکار ہونے سے کب مفر ہے، مگر ہے گلزار دُکھ اِسی کا
ابھی اسے چاہیے تھی مہلت، ابھی پرندہ اُڑان میں تھا

.....

جناب عطاالعزیز، جناب گلزار بخاری، جناب اقبال راہی

آخر میں کچھ ذکر شاہ جی کے ترنم کا___

مترنم آواز اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی عنایت ہے___ اُردو شاعری کی تاریخ میں بہت بڑے بڑے نام حُسنِ کلام کے علاوہ حُسنِ ترنم کے حوالے سے بھی معروف و مقبول ہوئے: جگر مرادآبادی کا مخمور ترنم، حفیظ جالندھری کا غنائیہ ترنم، علامہ اقبال کا دلگداز مترنم۔ (جی ہاں علامہ گرجنے برسنے کے علاوہ گنگنانے میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ ترنم سے اپنا کلام پڑھتے تو سامعین پر وجد طاری ہو جاتا تھا) مظفر وارثی کا مدھر ترنم، حبیب جالب کا کھنکھناتا ترنم اور طفیل ہوشیارپوری کا سوگوار ترنم محفلوں کی جان ہوا کرتا تھا۔

میرے خیال میں ترنم کے حوالے سے گلزار طفیل ہوشیارپوری سے متاثر ہیں، کیونکہ طفیل کی طرح گلزار بھی زیادہ تر راگ پہاڑی اور راگ ایمن میں نغمہ سرا ہوتے ہیں۔ پہاڑی اور ایمن زیرِ سطح حسرت کی ایک لہر سی ہے، جو دلوں میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ یوں گلزار خواص (اہلِ سخن) اور عوام، دونوں طبقوں میں یکساں مقبول ہیں۔ خواص میں اپنے شعری محاسن کی وجہ سے، اور عوام میں ترنم کی بنا پر۔

گلزار کے فن اور شخصیت کے حوالے سے میں ستار سید کی اس رائے سے سو فیصد متفق ہوں کہ:

''جدید، مگر کلاسیکی رچاؤ سے لبریز لطیف اور شائستہ لہجہ، ایک تحیر آمیز خون اور ایک زندگی مآب امید یک جاں ہوں تو گلزار بخاری بنتا ہے۔''

☆☆☆☆☆

جناب کرامت بخاری، جناب گلزار بخاری

گلزار بخاری کی کتاب ''ہوا پتّے گرائے گی''

کتاب کے سرورق پر ایک درخت کی تصویر ہے، جس کی شاخیں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں اور اُن سے ٹوٹتے ہوئے پتّے زمین پر گر رہے ہیں، مگر غور طلب بات یہ ہے کہ یہ پتّے زرد نہیں ہیں، سرخ ہیں اور پتّے گرنے کے باوجود پیڑ کی شاخیں اور تنا اُسی طرح مضبوط نظر آ رہا ہے جیسے کہ وہ موسمِ بہار میں ہوگا۔ بلکہ موسمِ خزاں میں وہ اپنے پورے قد سے کھڑا ہو کر اس کی سختیوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔

حضرات، کیوں نہ خزاں میں بھی اپنی جڑیں مضبوطی سے گہری زمین میں گاڑے اس پیڑ کو گلزار بخاری کہا جائے اور اس کی شاخوں سے گرتے ہوئے سرخ پتّوں کو اس کی شعری متاع کہا جائے، جس کے ہر شعر میں اس کے خونِ جگر کا عکس جھلک رہا ہے! ایسا کہنے سے مجھے اس زرخیز اور توانا شاعر کے بارے میں بات کرنے میں آسانی ہو جائے گی جو گزشتہ پینتالیس برس بل کہ اس سے بھی زیادہ عرصے سے اپنی شعری کائنات تشکیل دے رہا ہے، ستّر کی دہائی میں جو نام لوحِ ادب پر واضح انداز میں نقش ہوئے اُن میں گلزار بخاری کا نام بھی شامل ہے۔ نہ جانے کتنے (مرحوم) اور زندہ ادبی جرائد میں اس کا نام دیکھا اور اس کا کلام پڑھنے کا موقع ملا ہے کہ خود میرا نام بھی ستّر کی دہائی کے حوالے سے ہی کہیں کسی مدھم پڑھتی روشنائی میں لکھا ہوا ہے اور اس لیے میں گلزار بخاری کو اپنا ہمعصر کہوں تو غلط نہ ہو گا، بلکہ اسے یوں کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ گلزار بخاری میرا ہم عصر نہیں، میں گلزار بخاری کا ہم عصر ہوں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس نے اتنا کچھ اور اتنا اچھا لکھنے کے باوجود اپنا شعری مجموعہ لانے میں اتنی دیر کر دی، مگر آخر کسی کو تو ''دیر آید درست آید'' کی مثال صد فیصد درست ثابت کرنا ہی تھا، سو گلزار بخاری نے کیا اور خوب کیا!

''ہوا پتّے گرائے گی'' کے ابتدائی صفحات پر موجود ایک سطر کے مطابق اس کتاب میں اس کا 1972 سے 1982 تک کل دس برس کا کلام شامل ہے یعنی جو کچھ اس نے آج سے پینتیس برس قبل مکمل ہونے والی دہائی میں لکھا، اس سوال سے قطع نظر کہ 1972 سے پہلے کا اور 1982 سے بعد کا کلام کب منظرِ عام پر آئے گا، جب میں نے کتاب کا

نسیمِ سحر

مطالعہ کیا تو کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ کلام آج سے تینتیس برس اور اس سے بھی پہلے کا ہے۔ اس شاعری کو کسی طرح بھی ماہ و سال کے پیمانے پر ناپ کر اسے عہدِ گزشتہ یا قاف میم (یعنی قبل از مسیح) کی شاعری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں۔ میں اُسی کا ایک کم از کم تینتیس برس پہلے کہا گیا مگر بالکل تازہ بہ تازہ شعر پیش کرنا چاہوں گا:

حال و ماضی ہی نہیں گلزار میرے سامنے
کل جو سوچا جائے گا مجھ کو شعور اس کا بھی ہے

.....

تو ایسا ہے کہ اچھی شاعری کبھی کسی زمانی تجدید کا سامنا نہیں کرتی، گلزار بخاری کی کوئی ایک غزل بھی زنگ آلود یا قدیم محسوس نہیں ہوتی۔ دراصل اس نے روایت کی زمین میں اپنے پاؤں مضبوطی سے جما کر ہر عہد کے سرد و گرم کی زمیاں اور سختیاں جھیل کر اس عہد کی زبان میں اپنی بات کہی ہے اور یوں روایت اور جدت کا ایک ایسا خوب صورت امتزاج پیش کیا ہے کہ اس کی تازہ کاری اس کے ہر شعر کو مہکا رہی ہے اور تخلیقی وفور سے لبریز اُس کی شاعری دوامی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ بلاشبہ وہ ایک قادرالکلام شاعر ہے، اس کا اندازہ یوں بھی ہوتا ہے کہ کچھ زمینوں اور ردیفوں میں اس کی ایک سے زیادہ غزلیں شاملِ کتاب ہیں اور کہیں بھی اس پر اُنگلی نہیں اُٹھائی جا سکتی کہ بسیار گوئی کے سبب اس کے معیارِ شعری میں کوئی فرق آیا ہے۔ مانوس بل کہ پامال زمینوں میں بھی، اور ان قافیوں اور ردیفوں کے ساتھ بھی گلزار نے غزلیں کہی ہیں جن میں پہلے بہت سے شاعر طبع آزمائی کر چکے ہیں اور کمال یہ ہے کہ یہ مضامین اور تراکیب بھی اس کے یہاں آ کر اپنا الگ تاثر قائم کرتی ہیں اور ندرتِ بیان کے باعث اچھوتی اور نئی لگتی ہے، یہ سب طویل فنی ریاضت کے بغیر نہیں ہوتا۔ مثلاً اس شعر میں ترکِ مراسم اور تجدیدِ ملاقات جیسی تراکیب دیکھیے:

ہے تاسف بھی تجھے ترکِ مراسم پہ بہت
اور تجدیدِ ملاقات گوارا بھی نہیں

.....

ایک اور پُرانے مضمون پر گلزار بخاری کی اپنی منفرد چھاپ دیکھیے:

کرتا ہے بسر اور کوئی زیست ہماری
ہم لوگ تو ہیں شام و سحر کاٹنے والے

.....

اس کی شاعری ذات سے کائنات، اور دروں سے بروں کی جانب سفر، اور پھر کائنات سے ذات کی جانب مراجعت کا ایک استعارہ ہے، غمِ ذات کو غمِ کائنات کے حوالے سے اور غمِ کائنات کو غمِ ذات کے تناظر میں دیکھنے کے لیے گلزار بخاری کا شعری سلیقہ چاہیے:

عکس کس کس کا نہ پایا اسی آئینے میں
ہم غمِ ذات سے رنجِ دگراں تک پہنچے

.....

اس کے یہاں ذات کی تنہائی، محبت، بیوفائی جیسے موضوعات بھی ہیں، جن کے زیرِ اثر وہ کہتا ہے:

کوئی پتا بھی رفاقت میں نہ پورا اُترا
پیڑ پت جھڑ کی ستم گاہ میں تنہا اُترا

.....

ہے وقت ابھی لوٹ چلو ، اس کو منالو
کل تک وہ درِ دل کو مقفّل ہی نہ کر دے

.....

رومانویت اس کی غزلوں اور نظموں کا ایک اہم عنصر ہے:

لیکن اِک ہے کمال کا موسم
کشفِ حسن و جمال کا موسم
وہ ہے تیرے خیال کا موسم
(نظم: کمال کا موسم)

اور جو لوگ ترکِ محبت کے لیے کوئی جواز تراش لیتے ہیں ان کو ایک عجب پیرایے میں جواب دیا ہے، جس سے یکدم "تجھ سے دلفریب ہیں غم روزگار کے" کے مشہور مصرع بھی ذہن میں آ جاتا ہے اور عشق کے حوالے سے گلزار بخاری کا اپنا نظریہ بھی واضح ہو جاتا ہے:

ثابت قدم رہا نہ گیا جن سے عشق میں
الزام دے رہے ہیں وہی روزگار کو

.....

تاہم ذاتی اور رومانی حوالوں سے کی جانے والی شاعری گلزار بخاری کی کثیر الجہت شاعری کا ایک بہت محدود حصہ ہے، اس کی شاعری کا اصل اور وسیع کینوس اپنا وطن، اس میں حکمرانوں اور دیگر عناصر کے ہاتھوں سے عوام کا استحصال، منفی معاشرتی اور سیاسی رویے اور قیام پاکستان کے بعد جلد ہی شروع ہو جانے والی وہ بندر بانٹ ہے، جس کے نتیجے میں ایک مخصوص طبقے کو چھوڑ کر عوام قابلِ رحم زندگی گزار رہے ہیں۔ گلزار بخاری نے ان رویوں کو کہیں کہیں لطیف اور کہیں کہیں بلند بانگ لہجے میں ہدفِ تنقید بنایا ہے:

سفینے کے مسافر محو ہیں آپس کے جھگڑوں میں
بھنور میں جھونکنے پر ناخدا کو کون روکے گا

یہ کہہ رہے ہیں مری چھاؤں چھیننے والے
شریک دھوپ کی سازش میں ہیں شجر میرے

اب تو آثار بھی دانوں کے نہیں خوشوں میں
کھیت میں غول پرندوں کا یہ کیسا اُترا

خود ہی سے رہی لڑائی میری
قائم رہے کیا اکائی میری

.....

مگر ہر حقیقت پسند فنکار اور تجزیہ نگار کی طرح گلزار بخاری اس مجموعی صورت حال میں عوام کو بھی کسی حد تک شریک سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اپنی تباہی کے ذمہ داری خود بھی ہیں کہ ایسے لوگوں کو ووٹ دے کر اپنے آپ پر مسلط کرتے ہیں جو گزشتہ کئی عشروں سے ہمارا استحصال کر رہے ہیں:

اب تمھیں ڈسنے لگے ہیں تو شکایت کیسی
سانپ بستی میں ہیں پروردہ تمھارے اپنے!

.....

گلزار بخاری اس حقیقت سے بھی آگاہ ہے کہ بعض اوقات شعر میں سب کچھ کہنے کے بجائے کچھ چھوڑ دینا چاہیے جسے قاری یا سامع مکمل کرنا چاہیے۔ اس کے ایک شعر نے مجھے یوں اپنی جانب کھینچا کہ میں اسے یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ آپ بھی دیکھیں کہ اُس نے اخبار اور ٹھنڈا ناشتہ جیسے الفاظ برت کر اپنے ملکی حالات پر کیا کچھ کہہ دیا ہے:

صبح کے اخبار پر نظریں جمی رہ جائیں گی
ناشتہ پھر میز پر ٹھنڈا پڑا رہ جائے گا

.....

اور یہ شعر بھی دیکھیے:

چھڑک دیا ہے معالج نے زہر زخموں پر
ہمارے درد کا اب کے عجیب چارہ ہوا

.....

کوئی شک نہیں کہ کلاسیکی شعری روایت سے پورے طور پر جُڑا ہوا یہ شاعر مصرع سازی کے ہنر اور نئی شعری و لفظی ترکیب پر عبور رکھتا ہے اور پورے تخلیقی رچاؤ اور فنی التزام کے ساتھ شعر کہتا ہے اور ردیف و قافلے کی مکمل ہم آہنگی کے ساتھ روایتی یا کلاسیکل لہجے میں بھی جدید سوچ اور خیال کو پوری تازہ کاری اور ریزہ کاری کے ساتھ یوں اُجاگر کرتا ہے کہ خیال اپنی پوری رنگینی اور زیبائش کے ساتھ ایک خوب صورت پیکر میں ڈھل کر ہماری پوری توجہ کھینچ لیتا ہے۔

گلزار بخاری کا ایک اور وصف یہ دیکھا کہ جو موضوعات عام طور پر صرف نظم میں پروئے جاتے ہیں انھیں بھی کامیابی کے ساتھ غزل میں سمویا ہے اور ان میں تغزل کی چاشنی بھی بھر دی ہے۔ ان کی چند نظمیں بھی کتاب میں شامل ہیں اور بلاشبہ وہ بھی اچھی ہیں، لیکن میرے ذاتی خیال میں ان میں سے بھی وہی نظمیں اچھی ہیں جو غزل کے پیرایے میں کہی گئی ہیں۔ چنانچہ گلزار بخاری کے لیے میں غالب کا یہ مصرع نہیں دہرانا چاہتا کہ:

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

☆☆☆☆☆

محترمہ صائمہ الماس اور جناب گلزار بخاری

جناب محسن نقوی اور جناب گلزار بخاری

گلزار بخاری ___ نظم گوئی

نظم کے لفظی معنی موتیوں کو ایک لڑی میں پرونے کے ہیں۔ اصطلاح شعر میں اس سے مراد ہے اشعار کو ایسے مجموعے میں لکھنا، جس میں صرف ایک ہی خیال ادا کیا گیا ہو۔ نظم میں صنفِ غزل کی نسبت خارجی حالات و واقعات سے متعلق خیالات کے اظہار کی زیادہ گنجائش ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نظم شاعر کی ذات اور اس کی اندر کی دنیا سے کم اور باہر کی دنیا سے زیادہ متعلق ہوتی ہے۔ خارجی شاعری عام طور پر بیانیہ ہوتی ہے جس میں مختلف واقعات وحوادث اور مختلف مناظر وتصاویر کی عکاسی کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں شاعر اپنی شخصیت کو نظم کا حصہ بنا سکتا ہے۔ یہ چیز روایتی نظموں پر تو صادر آسکتی ہے مگر آج کی جدید نظم ادب اور زندگی کے مختلف رویّوں اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہے شاعر کسی واقعے یا حادثے سے متاثر ہوکر دل کی گہرائیوں سے اپنے انفرادی اور ذاتی تاثر کا اظہار کر دیتا ہے اور اس کا انداز تجرباتی ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے جدید نظم داخلیت اور خارجیت کا خوب صورت ملاپ ہے۔

نظم کے لیے کسی ہیئت اور موضوع کی پابندی بھی نہیں ہے۔ کائنات اور انسان کے متعلق کسی بھی موضوع پر شاعر اپنے احساسات بہ صورت نظم بیان کر سکتا ہے۔

نظم کی تاریخ میں چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں خواجہ نظامی اور آزری کا کلام اہمیت کا حامل ہے۔ سولھویں اور سترویں صدی میں قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں نظم کے سلسلے میں محمد قلی قطب شاہ، ابراہیم، عادل شاہ، میرانجی، ہاشمی، نصرتی، وجہی، غواصی، شوقی، ابن نشاطی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن میں محمد علی قطب کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے خالص ہندوستانی پھلوں، ترکاری اور شکاری چڑیوں کو منظوم کیا۔ شادی بیاہ، ولادت کے رسم و رواج، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی تہواروں مثلاً دیوالی، ہولی، عید، بسنت وغیرہ کو بھی موضوع بنایا اور اپنی نظموں کو غزل کی ہیئت میں لکھا ہے۔

جب اردو شعری ادب کا مرکز جنوب سے

شائستہ اعوان

شمال میں منتقل ہوا تو نظم کے مقابلے میں غزل کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ اس دور کے شعرا خلی واردات کے بیان کے لیے غزل میں طبع آزمائی کرتے رہے اور مذہبی جذبات کے اظہار کے لیے مرثیہ کو بروئے کار لائے۔ دکنی دور کے بعد بھی اردو میں لاتعداد مثنویاں لکھی گئیں۔ سراج اور رنگ آبادی کی مثنوی ''بوستان خیال'' سے لے کر مرزا داغ کی مثنوی ''فریاد داغ'' تک تقریباً دو سو سال کا عرصہ ہے، جس میں سینکڑوں مثنویاں لکھی گئیں۔ مثنوی نگاروں میں میر تقی میر، میر حسن، دیا شنکر نسیم کے نام اہم ہیں۔ ان کے علاوہ نظیر اکبر آبادی، ذوق، کی مثنویاں بھی نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔ مجنوں گورکھپوری اپنے ایک مضمون ''جدید نظم کی ہیئت و تشکیل'' مشمولہ نگار جدید شاعری میں رقم طراز ہیں:

''نظم دراصل وہی صحیح معنوں میں نظم کہلانے کی مستحق ہے، جس میں بالیدگی ہو اور انتہا ہو اور ہر جز واس کُل میں ختم ہو جائے کہ کہیں سے جھول معلوم نہ ہو۔''

اس لیے مصرعوں کو اس طور ترتیب دینا کہ مرکزی خیال اپنی تمام تر ذیلی کیفیات کے جلو میں تخلیقی توانائی کے ساتھ نظم کے کینوس پر اُجاگر ہو، تخلیقی فطانت اور شعوری ذہانت کے بغیر ممکن نہیں ہوا کرتا۔ گلزار بخاری کی نظمیں اس کیفیت کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے بڑی عمدہ نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان میں زندگی کی لاتعداد راہیں روشن ہیں۔ گلزار بخاری وطنِ عزیز کی سچی محبت دل میں رکھتے ہیں۔ اس جذبے کا اظہار ان کی نظم ''امید بہاراں'' میں بہت نمایاں ہے۔ وطن کی حالتِ زار پر ان کا دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ زندگی کی کڑی مسافت میں یہ وطن گھنی چھاؤں کی طرح ہے۔ کہتے ہیں:

غربت کی کڑی دھوپ میں تپتے ہوئے بن میں
لائی تیری شفقت ہمیں سائے کی فضا میں
آسودہ ہوئے تیری گھنی چھاؤں میں آ کر
دکھ بھول گئے سب ترے دامن کی ہوا میں
ہم کتنے تہی دست و تہی مایہ تھے لیکن
خوش حال کیا ہم کو ترے برگ و ثمر نے

.....

اُن کے نزدیک یہ وطن ہمارے لیے ایک سبز شجر ہے۔ اس کو کاٹ ڈالنے کی غرض سے کئی مفاد پرست ہاتھ اس کی طرف آری بڑھاتے ہیں اسے گزند پہنچاتے ہیں۔ اگر اس عمل کو روکا نہ گیا تو اس ہرے شجر کی جڑیں کٹ جائیں گی۔ گلزار ایک باخبر اور باشعور فرد کی طرح یہ جانتے ہیں کہ جب تک اپنے

سازش میں شامل نہ ہوں کوئی دوسرا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس خوف کا اظہار بھی نظر آتا ہے کہ ہیں اس شجر پر ہمیشہ کے لیے خزاں نہ آجائے۔ یہ وہ خوف اور خدشہ ہے، جس میں موجودہ دور کا ہر محبِ وطن مبتلا ہے:

ہوتے نہ اگر شاملِ سازش ترے اپنے
یلغار کی اعدا میں جسارت ہی نہیں تھی
ترے لیے بنتا کوئی نقصان کا باعث
ایسی کسی بدکوش میں ہمت ہی نہیں تھی

.....

خاک بدہن تجھ پہ اگر آنچ پھر آئی
ہم کو رہِ تسکیں بہم آئے گی کیسے
وابستہ ترے دم سے ہے امید بہاراں
کچھ ہو گیا تجھ کو تو خزاں جائے گی کیسے

.....

انھوں نے اپنی نظم ''گوشوارہ'' میں یوم آزادی کے روز خود احتسابی کی ضرورت پر زور دیا ہے کہ جشن آزادی منانے سے اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا نہیں ہو جاتا۔ قوم کو اجتماعی طور پر اپنی کارکردگی کا جائزہ بھی لینا چاہیے۔ انھوں نے نظم کے درج ذیل دو بندوں میں کتنے دُکھ سے اِس اَمر کا اظہار کیا ہے:

نمو کی رُت میں بھی ہم کال سے باہر نہیں آئے
ہمارے خواب استحصال سے باہر نہیں آئے
ملی تھی ہم کو آزادی کی نعمت کیا اسی خاطر
کہ ہم اب تک فرنگی جال سے باہر نہیں آئے
ہنر دھرتی کو جنت میں بدلنے کا بھلا ڈالا
فضا کو تفرقہ بازی سے اک دوزخ بنا ڈالا
وطن ہم کو دیا تھا اجتماعی سخت کوشی نے
دماغ و دل میں ہم نے خود پرستی کو بسا ڈالا

.....

ان کی نظم جس کا عنوان ''قائداعظم کے لیے'' یہ نظم میں بابائے قوم کی خدمت میں خراج تحسین ہے۔ انھوں نے اس نظم کے آٹھ شعروں میں قائداعظم کی تمام تر سیاسی جدوجہد، استقامت اور عزیمت کو سمیٹ لیا ہے۔ اشعار دیکھیے:

بدن ترا یوں تو ناتواں تھا مگر ترا عزم سخت جاں تھا
ہوا جو کوہِ گراں مقابل رہِ سفر سے ہٹا کے چھوڑا
کمال تھی ناخدائی تیری کہ عین طوفان کے دنوں میں
ترا سفینہ کہ تھا شکستہ اسے کنارے پہ لا کے چھوڑا

.....

گلزار کی ایک نظم مادرِ ملت کے نام ہے جس میں ان کو ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ مادرِ ملت فاطمہ جناح کو اپنے بھائی سے بہت محبت تھی۔ انھوں نے تمام عمر دل و جان سے اپنے بھائی کی خدمت اور غم گساری کی۔ بہن بھائی کی اس عظیم محبت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قائد کی عظمت کا اعتراف بھی اس نظم

جناب آفتاب کاوش، جناب مشکور حسین یاد، جناب پروفیسر منہاس، جناب طالب جوہری، جناب گلزار بخاری

میں ہے اور قومی سطح پر فاطمہ جناح کے مقام و مرتبے کو بھی بیان کیا ہے:

سمجھتے ہیں ترے بھائی کو ہم بابائے قوم اپنا
تجھے دیتے ہیں ماں کا احترام اے مادرِ ملت
ہماری ذات سے تجھ کو نکالے کس طرح کوئی
ہمارے دل میں ہے تیرا قیام اے مادرِ ملت

.....

قومی جذبے اور احساس کے اظہار کے ساتھ ساتھ گلزار بخاری کی نظم ایک عاشق کے جذبات اور احساسات کی بھی عکاس ہے ان کی رومانوی نظموں میں محبت کی بھرپور فضا ہے۔

گلزار کی نظموں میں ہمیں فکری پختگی کے ساتھ فنی اعتبار سے بھی مکمل بالیدگی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں زبان و بیان کی نزاکتیں اور لطافتیں ان کے گہرے لسانی شعور کا پتہ دیتی ہیں داخلی کیفیات، تہذیبی تشخص، ثقافتی تنوع اور پیچیدہ سماجی صورت حال کی آئینہ داری کے لیے انھوں نے نظم کے پیرائے کا سفر اختیار کیا اور اس سفر کو کامیابی سے طے کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

جناب گلزار بخاری گورنمنٹ وارث شاہ ڈگری کالج کی ایک تقریب میں۔

گلزار بخاری بحیثیت غزل گو

پچاس کی دہائی کے بعد صنف غزل نے پھر سے عروج حاصل کرنا شروع کیا - جب معاشرے میں مختلف افراد نے بہتر مقام و مرتبے کے حصول کے لیے تگ ودو شروع کی، جس نے سماجی ادراک میں اضافہ کیا- اس کی تنقید غزل میں آئی، گویا یہ ایک تہذیبی انتشار برپا ہوا جو غزل میں نمایاں ہوا- شعرا کی بڑی تعداد ایسی تھی جو شہروں کی صنعتی اور ہنگامہ آرا زندگی سے بیزار تھی- متوسط طبقے کے ذہن اور اخلاقی شعرا کے ہاں تنہائی کا احساس بہت شدت سے ابھرا- نیز ان کے لہجے میں جھنجلاہٹ، بغاوت اور احتجاج پیدا ہوا- رشید احمد صدیقی اپنے ایک مضمون ''مطالعہ غزل'' میں لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی میں غزل اور غزل گویوں کا مقابلہ غزل اور گویوں سے تھا- بیسویں صدی میں دونوں کا مقابلہ زندگی زمانہ اور ذہن کے سیل بے اماں سے رہا جدید شعرا کے سبب غزل میں قدیم علائم اور استعاروں کی مدد سے تخلیقی پیکروں کی تخلیق کا عمل جاری رہتا ہے نیز غزل میں ایک نئی معنویت اور ایک نیا ویژن سامنے آتا ہے-''

جدید غزل اپنے رویے، لب و لہجے، فکر اور نفسیات کے اعتبار سے اپنا رنگ بدلتی ہوئی عہد حاضر تک پہنچتی ہے- دور حاضر کی غزل کا ایک اہم نام گلزار بخاری کا ہے- گلزار بخاری اُردو غزل کی ایک جان دار آواز ہیں- غزل بجا طور پر گلزار بخاری کے تخلیقی جوہر کا پیش خیمہ ثابت ہوئی- انھوں نے غزل میں فکری اور فنی حوالے سے نہایت پختگی کے ساتھ شعر و ادب کی دنیا میں ''ہوا پتے گرائے گی'' کی صورت میں ایک بیش قیمت اور گراں بہا اضافہ کیا- وہ غزل کی اعلیٰ روایات کا پاسدار اور امین ہے- ''ہوا پتے گرائے گی'' میں 66 غزلیں شامل ہیں- یہ کتاب ان کی 1972 سے لے کر 1982 تک کی شاعری پر محیط ہے-

شاعری ایک وہبی ملکہ ہے اس لیے شعرا وہ اچھا مانا جاتا ہے جس میں آمد اور بے ساختگی ہو- گلزار بخاری کو یہ صفت اللہ تعالیٰ کی خاص عطا ہے اُن کی شاعری میں وارداتِ قلبی کا بہت دخل ہے کیونکہ ایک تو خود اُن کی زندگی ''جہدِ مسلسل'' کی تصویر ہے اور دوسرے خارجی ماحول نے اُن کی داخلیت پر بے انتہا اثر کیا ہے- لہٰذا اُن کی شاعری میں گداز کا عنصر در آیا ہے- کہتے ہیں:

تو اکیلا نہیں جیون میں حوارث کا شکار
زندگی ہے تری گلزار ہزاروں جیسی

شائستہ اعوان

دیکھو تو زر و مال نہیں پاس ہمارے
سوچو تو یہی درد کی دولت بھی بہت ہے

.....

اس سوز اور گداز کے اظہار کے لیے غزل سے بڑھ کر کوئی صنف اردو شاعری میں موجود ہیں۔ گلزار نے بھی ابتدا سے غزل ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ غزل شعری روایت کی امین صنفِ سخن ہے۔ اگرچہ بعض کے نزدیک یہ روایت محض قصہ گل و بلبل اور افسانہ ہجر و وصال کی داستان ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ایک باوضع اور حیادار تہذیب کی ترجمان ہے اور اس تہذیب سے مکمل آگاہی رکھنے والے اور اس کی پاسداری کرنے والے گلزار بخاری کا یہ کمال ہے کہ وہ اپنے اشعار کو روایت سے جوڑتے ہوئے معنی کے بے شمار گلزار کھلا دیتے ہیں:

حالانکہ ہمیں تجھ سے شکایت بھی بہت ہے
دُشوار ہے دوری کہ محبت بھی بہت ہے

قائم اسی بنیاد پہ ہیں تجھ سے مراسم
رنجش ہی نہیں، ہم میں مروّت بھی بہت ہے

اک شوق ترا دم کہیں لینے نہیں دیتا
ہر چند کہ اس راہ میں زحمت بھی بہت ہے

.....

خواہش و خواب کا اظہار تو کر سکتے ہیں
تجھ سے ہم ذہن کو سرشار تو کر سکتے ہیں

تو ستارا ہے، چمکنا ہے فلک پر تجھ کو
ہم زمیں سے ترا دیدار تو کر سکتے ہیں

یہ ضرور ہے کہ گل و بُلبل کی شاعری جذبہ محبت کی شاعری ہے اور جذبہ محبت یقیناً تمام جذبات انسانی سے زیادہ قوی ہے۔ اردو شاعری حسن و عشق کے مضامین سے بھری پڑی ہے تقریباً تمام شعرا نے اس سے وابستہ مضامین پر خیال آرائیاں کی ہیں ہر شاعر نے بساط بھر اپنے انفرادی تجربات کو نیا پیکر عطا کر کے اس موضوع کو نبھایا ہے۔ یہی صورت حال گلزار کے ہاں بھی ہے۔ گلزار اساتذہ کے بحر شعر و سخن میں غوطہ زن ہوئے۔ ان سے بیان کا لطف اور لب و لہجہ سیکھا اور پھر اس میں اپنے مزاج کے رنگا رنگ پھول کھلائے:

کیا عشق نے تجھے مضطرب نہ رہا سکون تو کیا ہوا
نہیں یہ بھی کم ترا حوصلہ دل بے قرار گیا نہیں

اس کی آنکھیں مجھ کو دیتی ہیں اشارہ دور سے
رازداں میرا ہوا ہے اک ستارا دور سے

اس میں کسی کی جان گئی ہے تو تمھیں
تم نے تو آزما لیا خنجر کی دھار کو

.....

عشق کے بیان میں اُن کے ہاں جذباتیت ملتی ہے اُن کا تصور عشق بھی اردو کی روایتی غزل کے تصور کی طرح ہے اُن کی غزل کا عاشق بھی محبوب کے ظلم و ستم اُٹھاتا ہے مگر شکوہ لب پر نہیں لاتا

☆☆☆☆☆

گلزار بخاری_ مختصر آرا

.....حسن عسکری کاظمی.....

گلزار بخاری ایک منجھے ہوئے پختہ کار اور قدرے دبنگ انداز اظہار رکھنے والے شاعر ہیں جو مختلف اصناف سخن میں کمال مہارت رکھتے ہیں، وہ غزل، رباعی، مسدس، نظم معریٰ اور فی البدیہہ قطعہ نگاری میں احساس کا ہمہ جہت آئینہ دکھانے پر قادر ہیں، ان کی غزل غمِ ذات اور غمِ کائنات، دل شکستگی، حوصلہ و ہمت، شکایت زمانہ اور مظلوم کی خاطر آمادۂ حمایت ہونا نیز صلاحیت نہ ہو تو محرومی پر رنجیدہ نہ ہونا جیسے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے، یہ ایسے موضوعات ہیں کہ انھیں غزل کی نازک مزاجی کا لحاظ رکھتے ہوئے سلیقے کے ساتھ جامۂ اظہار پہنانا غیر معمولی ریاضت کا تقاضا کرتا ہے، گلزار بخاری گزشتہ چالیس برس بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ عرصہ پہلے قلم سنبھال چکے تھے، وہ اعتماد کے ساتھ دوسرے قلمکاروں اور شاعروں کے ہم رکاب شعر و ادب سے اپنی وابستگی کا عملی اظہار کر چکے تھے لیکن اپنی خودداری کو عزیز جانتے ہوئے وہ کسی ادبی گروپ کا سہارا لینے پر آمادہ نہ ہوئے، دوسرے وہ رباعی، قطعہ اور سلام یا رثائی شاعری کو آگے بڑھاتے رہے۔ شعری سچائی کی طرح شعری استدلال میں گلزار بخاری کا فن ہمعصر شاعروں میں نشان امتیاز رکھتا ہے، کسی دلیل کو ہنرمندی کے ساتھ متعارف کرانا آسان نہیں، یہ شعری دلیل غزل کی تاثیر کو فلک مآب بنا دیتی ہے جسے رد نہیں کیا جا سکتا، عقل و خرد کے علاوہ جذبِ صادق بھی اسے تسلیم کرتے ہوئے سرمست اور سرخوش ہو گا کہ شعری صداقت آفاقی بھی ہے اور آباد آشنا بھی:

کہانی کو پہنچنا ہے کسی انجام تک آخر
کسی سے ابتدا ہو، انتہا کو کون روکے گا
بچائے گی مجھے گلزار ممتا ہر مصیبت سے
مرے حق میں مری ماں کی دعا کو کون روکے گا

.....خالد علیم.....

گلزار بخاری ایک مستند غزل گو شاعر کے طور پر گزشتہ کم و بیش پینتیس سال سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ ''کاتا اور لے دوڑی'' کے قائل نہیں بل کہ اس عہد کے برق رفتار اشاعتی طرزِ عمل میں بھی اپنے سنجیدہ طرزِ تخلیق کے ساتھ شعر و ادب میں معیارِ فن کو پیشِ نگاہ رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُن کا تخلیقی سرمایہ تین دہائیوں سے زیادہ عرصے پر محیط ہونے کے باوجود تا حال ایک مجموعۂ غزل ''ہوا پتے گرائے گی'' طباعت آشنا ہو کر خاصی پذیرائی حاصل کر چکا ہے، تاہم ایسا ہرگز نہیں کہ اُن کا سرمایۂ شعر متذکرہ مجموعۂ غزل ہے۔ ابھی ایسا بیش تر کلام ہے جو طباعت آشنائی سے محروم ہے۔ گلزار بخاری محض غزل گو کے طور پر متعارف نہیں بل کہ اصناف شاعری میں رباعی بھی ان کے فنی اختصاص کی مظہر ہے جو یقیناً ان کے ایک مجموعہ رباعیات کی متقاضی ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ ان کا مجموعۂ نعت ہے۔ نعت میں

انھوں نے جہاں فنی و معنوی خصوصیات کو پیشِ نظر رکھا ہے وہیں ان کے ایمان و ایقان کی بھی ترجمان ہے۔ نعت معنوی اور لغوی اعتبار سے رسولِ اکرم کے محاسنِ سیرت کا بیانِ منظوم ہے جب کہ ہمارے اردو سرمایۂ نعت میں زیادہ تر استغاثے کو اوّلیں اور آپ کے محاسن و مکارم پر کم توجہ دی جا رہی ہے، گو کہ یہ امر مسلمہ ہے کہ نعت اوّلیں حیثیت میں فروغِ سیرت کا ایمانی وسیلہ ہے۔ میرے لیے گلزار بخاری کی نعت کا یہ پہلو خوش آئند ہے کہ انھوں نے نعت کے معنوی پرتو سے اپنے سرمایۂ نعت کو فنی و فکری صلاحیتوں کے ساتھ اُجاگر کیا ہے، اور کہیں کہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر ان کے جوہرِ تخلیق کا تاب دار عنصر نعت کے گوہرِ آب دار سے کچھ یوں منزہ و مصفّٰی ہو کر سامنے آتا ہے کہ بقول محسن کاکوروی وہ یہ اشعار کہنے میں حق بجانب تھے:

''زباں ملی ہے مجھے نعت کے بیاں کے لیے''

یوں تو اُن کی ہر نعتیہ تخلیق جمال و اجمال کی ایمان افروز کیفیتوں کا پُر کیف اظہار لیے ہوئے ہے تاہم اس مجموعے کا اختصاص ان کی وہ نعتیہ قصیدہ ہے جس کا ایک ایک شعر اپنی تخلیقی روانی کی ولولہ انگیزی اور قوتِ ایمان کی دل آویزی میں بے مثال ہے۔ پہلے شعر کے بلند آہنگ تخلیقی بیانیے ہی سے اس نعتیہ قصیدے کا فنی و فکری معیار طے ہو جاتا ہے:

چند کھجوریں، جَو کی روٹی، ایک پیالہ پانی کا
طور طریقے درویشی کے، منصب ہے سلطانی کا

.....عطاالعزیز.....

نمود و نمائش سے بے غرض گلزار بخاری صاحب آسمانِ ادب کے ہر حلقے کی پرواز کر چکے اور مزید آسمانوں کی کھوج میں محوِ پرواز ہیں۔ میانوالی میں ان کے گاؤں کا نام 'نورنگہ' ہے اسی مناسبت سے میں ان کو شاعرِ نورنگ کہنا چاہتا ہوں کیونکہ ان کی شاعری میں مندرجہ ذیل نورنگ اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ موجود ہیں۔

(1) حمد (2) نعتؐ (3) منقبت (4) سلام (5) مرثیہ (6) غزل (7) نظم (8) رباعی (9) مزاح

بہت سے مشاعروں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کی صدارت گلزار بخاری صاحب نے کی اور مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں بہت سے مشاعروں کا صدر برادر رہا ہوں۔

آخر میں بخاری صاحب پر لکھے گئے ایک مقالہ سے اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں۔

'اردو زبان سے گلزار بخاری صاحب کو دلی وابستگی ہے۔ چونکہ وہ زبان پر پورا عبور رکھتے ہیں اس لیے الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے پاس موجود ہے وہ کسی بھی موضوع اور مرحلے پر اپنے خیالات کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنا سکتے ہیں۔

الغرض ہر زمانے میں بہت سے شاعر یا ادیب ایسے ہوتے ہیں جو دنیائے ادب میں گرانقدر خدمات انجام دیتے ہیں لیکن خود گمنامی کی تہہ میں رہتے ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے وہ آسمانِ ادب پر ابھرنے لگتے ہیں اور پھر ان کی اہمیت کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ آپ گلزار بخاری صاحب کا شمار بھی کچھ ایسے ہی شاعروں میں کر سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

نعتؐ

کیا کیا ہیں گہر دامنِ بحرین میں دیکھیں
اوصافِ نبی سیرتِ حسنین میں دیکھیں

سمجھیں رہِ زہرا و علی سے شہِ دیں کو
اک نور نظر آئے گا نورین میں دیکھیں

اک ضرب دو عالم کی عبادت سے ہے افضل
تفصیل ذرا قصۂ ثقلین میں دیکھیں

پوچھیں پرِ جبریل سے پرواز نبی کی
معراج ہے کیا منزلِ قوسین میں دیکھیں

ہو گا نہ جُدا شہرِ درِ علم سے ہر گز
مضبوط ہے کیا ربط فریقین میں دیکھیں

سایہ نہ ہو جس ذات کا ثانی ہو تو کیسے
ایسا کوئی انسان ہے کونین میں دیکھیں

ڈھونڈے نہ کہیں اور ملے گا وہیں گلزار
ہاں بوذر و سلمان کے نعلین میں دیکھیں

گلزار بخاری

غزل [نذر خالد احمد]

روش ہے سہل کہ دشوار دیکھ لیتے ہیں
سفر سے قبل ہی آثار دیکھ لیتے ہیں

نگاہ دیکھتی ہے سامنے کے منظر کو
شعور سے پسِ دیوار دیکھ لیتے ہیں

مراد، ذوق و طلب سے چھپی نہیں رہتی
طیور شاخِ ثمردار دیکھ لیتے ہیں

سوال ٹھیک نہیں ہر چراغ سے لَو کا
دیا ہے کس کا، طلب گار دیکھ لیتے ہیں

خریدنے کے لیے کچھ گرہ میں ہو کہ نہ ہو
گزر کے گرمیٔ بازار دیکھ لیتے ہیں

شریک ہم نہیں ہوتے یونہی کہانی میں
مبہم ہے کون سا کردار دیکھ لیتے ہیں

تعلقات میں غفلت روا نہیں گلزار
کسی سے کیا ہے سروکار دیکھ لیتے ہیں

گلزار بخاری

غزل

اور جا کر کہیں کرتا ہے سحر شام کے بعد
ختم ہوتا نہیں سورج کا سفر شام کے بعد

توڑ دیتی ہیں خموشی کو چہکتی چڑیاں
بولنے لگتے ہیں چپ چاپ شجر شام کے بعد

اُس کو خورشید نظر تک نہیں آنے دیتا
مرکزِ دید ٹھہرتا ہے قمر شام کے بعد

بھول جاتی ہے اُنھیں خلق ضرورت کے بغیر
یاد آتا ہے چراغوں کا ہُنر شام کے بعد

راستہ کون دکھاتا ہے اندھیرے میں اسے
کس طرح ڈھونڈتی ہے فاختہ گھر شام کے بعد

پھول اُجلے سے کھلائے ہیں فلک پر کس نے
کھیت چاندی کا ہے کیا پیشِ نظر شام کے بعد

قدرداں صرف ہے رب گریۂ شب کا گلزار
رنگ لائے گا ترا دیدۂ تر شام کے بعد

گلزار بخاری

غزل

بنیں جس گھڑی محبت خدوخالِ آشنائی
نہیں بھولتے کسی کو مہ و سالِ آشنائی

یہی خواب ہے سفر میں رہے تو سدا نظر میں
ہمیں جس طرف اڑائیں پر و بالِ آشنائی

کریں جاں نثار تجھ پر کہ فدا ہیں یار تجھ پر
جنھیں علم ہے گراں ہے زر و مالِ آشنائی

سبھی تجھ پہ مر رہے ہیں یہ گلہ بھی کر رہے ہیں
تجھے پاسِ دوستی ہے نہ خیالِ آشنائی

کبھی اس سے واسطہ ہے کبھی اُس سے رابطہ ہے
ترے زاویے سے ٹھہرا ہے کمالِ آشنائی

کس رخ سے تھے نہ غافل رہے یاد سب مراحل
ہمیں ورنہ مار دیتا یہ مآلِ آشنائی

نہیں ضبط کو گوارا کھلے تجھ پہ دکھ ہمارا
سو بیان تک نہ پہنچا غمِ حالِ آشنائی

گلزار بخاری

غزلیں

اک دوسرے کے درد میں شرکت کو کیا ہوا
موجود ہیں بشر بشریت کو کیا ہوا

منعم اسیر ہو گئے نام و نمود کے
غیرت کی پاسدار سخاوت کو کیا ہوا

باقی نہیں تمیز کوئی عشق و فسق میں
تطہیرِ قلب کیا ہوئی عصمت کو کیا ہوا

وابستہ ہو گئے ہیں مراسم مفاد سے
بے لوث دوستی کی روایت کو کیا ہوا

انسانیت کی تھی کبھی پہچان ہی یہی
اب کہ مگر خلوص و مروت کو کیا ہوا

کیوں پستیوں نے گھیر لیا ہے وجود کو
انسان کے وقار و متانت کو کیا ہوا

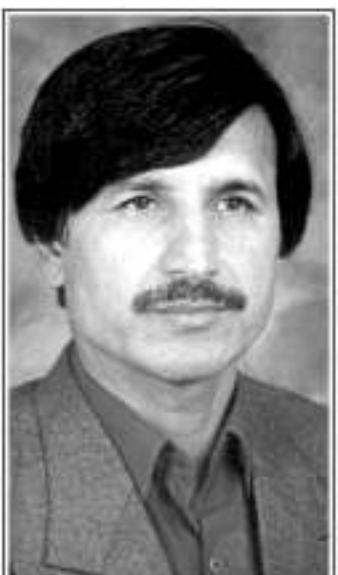

گلزار بخاری

مسافتوں کا فلک ستارے کا منتظر ہے
سفر کا موسم ترے اشارے کا منتظر ہے

اسی لیے ہم زباں پہ لائے ہیں ذکر تیرا
بیان کا حسن استعارے کا منتظر ہے

روا نہیں مصلحت پسندی تری طلب میں
خلوص اپنے لیے خسارے کا منتظر ہے

تری نظر کی تپش سے شعلے بھڑک نہ جائیں
بدن کا ایندھن کسی شرارے کا منتظر ہے

تلاش کرتے ہیں خواب تعبیر اپنی اپنی
صدف گہر کا، سفینہ دھارے کا منتظر ہے

نہیں ضروری کہ فکر ہو اُڑتے بادلوں کو
کہیں کوئی دشت ابر پارے کا منتظر ہے

تجھے تو گلزار پار کرنا تھا دوسروں کو
مگر تو اپنے لیے کنارے کا منتظر ہے

راستی کا سفر

سچ ہے زور آوروں کے پہرے میں
خود پرستی کے اس خرابے میں

سامنے کس طرح کی بستی ہے
جرم ہے آئنہ دکھانا بھی

سرنگوں شر کے سامنے دیکھی
جاں کریں تجھ پہ ہم فدا لیکن

زندگی خیر کو ترستی ہے
تو اسیر ایسے موسموں میں ہوا

جرم سے پیشتر سزا کا نفاذ
جب ہے انصاف خود کٹہرے میں

ہے یہ پہچان کس قبیلے کی

گلزار بخاری

لوگ

دیکھ لیجے فکرِ مذہب جو بھی ہو
حق یہی ہے آدمی کے واسطے

بس یہی اب قاعدہ قانون ہے
حد سے خواہش میں نہ گزرے کوئی بھی

زور و زر غالب ہیں منصب جو بھی ہو
ہے یہی نسخہ ہماری زندگی کے واسطے

ہو مروّج کوئی بھی آئین اگر
کس روش پر پاؤں دھر دیتے ہیں لوگ

کشفِ پا کی نوک پر دیکھے اصول
ایک پاؤ گوشت کی خاطر یہاں

حرص بن جائے کسی کا دین اگر
اونٹ پورا ذبح کر دیتے ہیں لوگ

آ گیا بندہ ہوس کے جال میں
اور سارے ضابطے ہیں مسترد

اس قدر الجھی ہے خلقت مال میں

حمایت

درختوں پر، مکانوں میں
ٹھکانا ڈھونڈتی چڑیو!
اُسی حرکت میں برکت ہے
ہنر سے ہمتوں سے
آب ودانہ ڈھونڈتی چڑیو!
مجھے تم سے محبت ہے
سحر ہوتے ہی شاخوں سے
لپٹ کر چہچہاتی ہو
خود اپنی ہی کمائی
لا کے کھاتی ہو
کسی کے حق پہ نظریں ہیں
نہ لوٹا رزق اُڑاتی ہو
پڑے جب شام اپنے
گھونسلے میں لوٹ آتی ہو
مگر پھر بھی نشانہ
بنتی رہتی ہو عقابوں کا
ستم کوئی نہیں کیوں
روکتا خانہ خرابوں کا
کیا فطرت نے حق جینے کا
جیسے دان
طالع آزماؤں کو
وہی آزادیاں
بخشی گئی ہیں فاختاؤں کو
سنو میں جان و دل سے
کھیلنے والوں کی مدحت کر نہیں سکتا
کسی صورت بھی
شِکروں کی حمایت کر نہیں سکتا

گلزار بخاری

بہار

گلزار بخاری

کبھی میں نے
محبت کے پرندوں کی
نوا سنجی سے
گھر خالی
نہیں دیکھا
کہاں کس نے
دوامی مہربانی کا
ہنر عالی
نہیں دیکھا
رہے غافل
گلستاں سے
کوئی بیدار خو
خالی نہیں دیکھا
لگاؤ ہے
لگن رب کی
صفاتی
دلبری
جس کو
سدا میں نے
بروئے کار دیکھا ہے
محبت کو
بہار آثار دیکھا ہے

رباعیات

کہہ دو دل و جاں سے کہ احد ہے اللہ
محتاج کہاں ہے کہ صمد ہے اللہ
اس کی احدیت پہ گواہی دیکھیں
والد ہے کسی کا نہ ولد ہے اللہ

.....

دل سے نہ کسی شخص کے جُوفہ نکلا
یہ ایک نیا اور شگوفہ نکلا
ظاہر میں دکھائی دیا مگر لیکن
اندر سے ہر اک شخص ہی کوفہ نکلا

.....

لب مدحتِ رحمٰن کرے مشکل ہے
دشواریاں آسان کرے مشکل ہے
کس طور سے جانے کوئی قاتل کا دوام
اندازہ یہ انسان کرے مشکل ہے

.....

مت بھاگ یونہی وہم و گماں کے پیچھے
کچھ سوچ ہے کیا بزمِ جہاں کے پیچھے
ترتیب و توازن سے یہ اُٹھتا ہے سوال
طاقت ہے کوئی کون و مکاں کے پیچھے

.....

ہر سانس کو انمول نگینہ کر دے
ہستی کے خرابے کو خزینہ کر دے
ہے کاشفِ اسرارِ حقائق تو ہی
یا رب تو کشادہ مرا سینہ کر دے

حق حمد سرائی کا ادا کیسے ہو
اظہارِ تحیر کے سوا کیسے ہو
ہم وصف محمد کے نہیں گن سکتے
محمود کی توصیف و ثنا کیسے ہو

.....

تفصیل کے ہر باب میں اکمل ٹھہرے
کردار میں گفتار میں افضل ٹھہرے
کہتا ہے یہی ماہِ ربی الاول
آخر میں بھی آ کر وہی اول ٹھہرے

گلزار بخاری

رباعیات

مندر کا مکیں پائے صنم چومتا ہے
کعبے کا محب سنگِ حرم چومتا ہے
جس عرش کو بوسے کی ہے خواہش سب کو
وہ صرف محمدؐ کے قدم چومتا ہے

.....

جی روزِ ازل سے وہیں لاگا ہوا ہے
احساس بھی پندار بھی جاگا ہوا ہے
رمضان کے دن نعتِ نبی کی باتیں
گلزار یہ سونے پہ سہاگا ہوا ہے

.....

امرت ہو کہ زہر اس میں سبو بولتا ہے
ہر حال میں ظرفِ من و تو بولتا ہے
چھپتے نہیں دنیا میں حسینؑ اور یزید
جیسا بھی کسی کا ہو لہو بولتا ہے

.....

کم کم ہی وفا قرب کو تجتے دیکھی
ہر بیج رفاقت سے ہی سجتے دیکھی
لازم ہے کہ ہو دوسرا بھی اس میں شریک
اک ہاتھ سے تالی نہیں بجتے دیکھی

.....

نام اور مقام کے حوالے سے بہت
تحسین کے معیار نرالے ہیں بہت
کردار کی تعظیم ہے کم لوگوں میں
منصب کو سلام کرنے والے ہیں بہت

ممکن ہے تو سجدے میں جھکاتا ہو جبیں
ہیں نطق و زباں مدحِ محمد کے امیں
رب نے نہ کیا فکر سے عاجز مجھ کو
فالج زدہ ہوں شکر ہے مفلوج نہیں

.....

تو خوش ہے کہ ترغیب ہوس ہے تجھ میں
لیکن یہ کشش چند نفس ہے تجھ میں
اے گل اسے بے لوث رفاقت نہ سمجھ
بھنورے ہیں ترے گرد کہ رس ہے تجھ میں

.....

اچھی ہے وہ عورت جو ہنر والی ہو
شوہر کے لیے خیر خبر والی ہو
لگتی ہے بھلی سب کو ہی اچھی بیوی
ہر چند کے فرعون کے گھر والی ہو

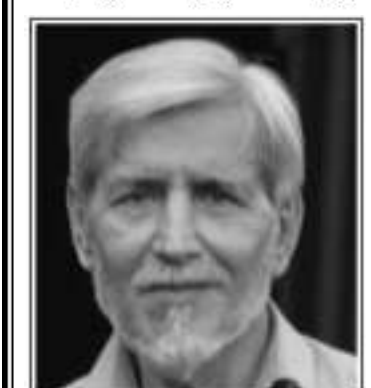

گلزار بخاری

حدودِ کعبہ کا تعین

خدا کا گھر بن گیا۔
خدا کے حرم کی حدود کا اب تعین ہونا تھا۔
حدود بھی سیّدنا جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے خدا نے طے کروائیں۔
جبرائیل امینؑ، سیّدنا ابراھیمؑ کو کعبہ کے گردا گرد لے کے پھرے یا کسی اونچے پہاڑ پہ کھڑے ہو کے چاروں طرف کی جگہیں دکھا دکھا کے نشان دہی کرائی ہوگی۔
بہر حال نشان دہی ہوئی۔
شاید اس سے کسی کو اندازہ نہ ہوا ہو۔
مشرقی حد پہ منیٰ اور عرفات سے ہوتی ہوئی خانوادہ ابراھیمؑ کی کہانی تو بن گئی،
باقی حدوں کی کیا کہانی ہے؟
وہ بہت بڑا کہانی کار ہے۔
ایسا کہ کوئی کام نہیں کرتا جس میں کوئی کہانی نہ ہو۔
کوئی راز نہ ہو، کوئی بشارت نہ ہو۔ خبر نہ ہو۔
مشرق کے الٹ، خانہ کعبہ کی مغربی حد دیکھ لیں۔

الحدیبیہ:
جبرائیل امین علیہ السلام جب سیّدنا ابراھیم علیہ السلام کو مغربی حد کا وہ کنواں دکھا رہے تھے یا اس کنویں کی جگہ جس کا نام الحدیبیہ ہونا تھا وہاں سبز باغ تھا۔ فاصلہ اس کا بھی حرم سے اتنا ہی ہے جتنا مشرقی حد عرفات کا۔ یعنی بائیس کلومیٹر۔ پہلے مشرقی حد دکھائی، پھر مغربی حد۔ اس وقت تو وہاں کچھ نہیں تھا۔ دو ہزار سال بعد وہاں رسولؐ آخر کے ہاتھ پہ ان کے چودہ سو وفاداروں نے جینے مرنے کا حلف دیا تھا۔ جب وہ سمے آیا، حلف دیا گیا۔ زمین و آسمان کا خالق خوش ہوا اور اپنا ہاتھ بھی ان ہاتھوں کے اوپر رکھ دیا۔
مغربی حد کہاں طے ہوئی پتہ چلا؟

حدیبیہ پہ
جگہ پہلے طے ہوگئی واقعہ بعد میں ہوا۔ واقعہ بھی صلح وآتشی کے عہد کا۔
حرم کی جنوبی حد کا تعین دیکھ لیں۔
خانہ کعبہ کے جنوب میں رکن یمنی کی سیدھ میں، سولہ کلومیٹر کی دوری پہ ایک جھیل نما خوش کن مقام ہے اضافہ لبن۔ قریب وہی جیسا سفید رنگت کا پہاڑ۔

ابدال بیلا

بعد میں قبیلہ خزاعہ وہاں آباد ہوا۔
اس قبیلے نے سیّدنا اسماعیلؑ کے سسرالی قبیلے بنو جرہم کو حرم سے بھگا بھی دیا۔ مدتوں حرم کی پاسداری کی۔ پھر ان کے کنبے میں ان کے تاجر کی بیٹی کا بیاہ اولاد اسماعیل کے سپوت قصی سے ہوگیا۔ کعبے کی دیکھ بھال کی ذمہ داریاں خزاعہ سے نکل کے پھر آل اسماعیلؑ کے پاس آ گئیں۔ بنی خزاعہ حرم کی گلیوں سے نکل کر کے، حرم کی حدود پہ آ گیا۔ دو ہزار سال گزر گئے۔ نبیؐ آخر کا زمانہ آ گیا۔ بنی خزاعہ رسولؐ عربی کا حلیف بن گیا۔ جب انہیں ان کے دشمن بنو بکر قبیلہ نے قریش کی مدد سے ان پہ حملہ کیا تو ایک عجیب بڑا واقع ہوگیا۔
صلح حدیبیہ کی تنسیخ ہوگئی۔
صلح کا معاہدہ ٹوٹ گیا اور یہی بات فتح مکہ کی وجہ بنی۔
اب سمجھ آ رہی ہے۔
حدود اتفاقاً طے نہیں ہوئیں تھی۔
ان حدود حرم میں، حرم کی ساری داستان چھپی ہوئی ہے۔
گزری بھی، گزرنے والی بھی۔
شمالی حد میں بھی کئی کہانیاں ہیں۔
شمال مغرب میں حرم کعبہ کی حد التنعیم ہے۔
کعبہ سے ساڑھے سات کلومیٹر دور جہاں آج کل مسجد عائشہؓ ہے۔ وہ تو نظر آتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی اسی احاطے میں کہیں ایک ایسا مقام ہے جو نہ کبھی خدا بھلا سکتا ہے نہ خدا کا رسولؐ آخر۔ یہ حضرت خبیبؓ اور سیّدنا زید بن دثنہؓ کی شہادت کی جگہ ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔ وہ پڑھے لکھے عاشق رسولؐ، مگر غریب مسلمان تھے۔ کچھ کافر انہیں دھوکے سے پکڑ لائے۔ مکہ میں فروخت کر دیا۔ خریدنے والوں نے بدر کی جنگ میں ان کے ہاتھوں مرنے والے اپنے باپ، چچا کا بدلہ لینے کے لیے انہیں پھانسی پر لٹکا دیا۔ ایک کو تلوار سے مارا دوسرے کو پھانسی پہ چڑھایا۔ پھانسی کا پھندا ابھی گرا نہیں تھا کہ اس عہد کے مشرکوں کے سردار ابوسفیان ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے آگے آیا اور خبیبؓ اور زید بن دثنہؓ سے پوچھنے لگا۔
تمہیں یہ خیال نہیں آتا کہ تم گلے میں رسی ڈال کے پھانسی کے انتظار میں لٹکنے کے بجائے مدینہ میں وہاں ہوتے جہاں تمہارے رسولؐ ہیں اور تمہاری جگہ پہ پھندا ان کی گردن میں ہوتا۔
خبیبؓ اور زیدؓ نے ابوسفیان کی پوری بات خدا جانے سنی یا نہیں۔ ایک کی پھانسی کے پھندے میں گردن پھنسی ہوئی تھی۔ دوسرے کی گردن سے سوا فٹ پہ ننگی تلوار تھی۔ جسم ایک تنکے کی طرح پیروں کے نیچے پڑے پتھروں پہ جھول رہے تھے۔ ابوسفیان کی باتیں سن کے ان کی آنکھیں خون سے لال سرخ ہوگئیں۔ لگتا تھا انھوں نے غور سے دیکھا تو آنکھوں کی جھلی پھٹ جائے گی۔ خون کا فوارہ نکلے گا۔ انھوں نے

مرتی ہوئی آنکھوں میں کائنات کی ساری زندگی کے راز بھر کے، ابوسفیان کی طرف دیکھا اور سرخ آنکھوں سے آنسوؤں کی، ہچکیوں کے ساتھ بولے:

''ابوسفیان میری ایک نہیں ہزار بار ایسے پھندے پہ پھانسی ہو۔ مگر میں ایک بار بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ میرے پیارے آقاؐ کے پیر میں ایک کانٹا بھی چبھ جائے۔ تو کم عقل کیسی بات کرتا ہے''۔

ابوسفیان اپنے موٹے پیٹ کے دونوں طرف سے ہاتھ اٹھا کے اپنی چندیا کو ملتے ہوئے بولا، اس طرح محبت کرتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا جس طرح محمدؐ کے وفادار ان سے محبت کرتے ہیں۔ یہی مقام تو خانہ کعبہ سے ساڑھے سات کلومیٹر شمال مغرب میں مسجد تنعیم کے برابر محبت میں جلے پروانے کی کہانی کا وقوعہ ہے۔

یہ حد حرم آقاؐ کے پروانوں کی محبت تھی۔

ایک حد اور بتاتا ہوں۔

تنعیم سے اوپر شمال کی طرف خانہ کعبہ سے تیرہ کلومیٹر دور

وادی نخلہ

مکہ سے طائف کا راستہ۔

یہاں کئی اہم باتیں ہوئیں۔ کہنے کو اسی کے پاس ''جعرانہ'' وہ جگہ ہے جہاں جنگ بدر سے کچھ پہلے، عبداللہ بن جحشؓ نے عمرو بن حضرمی کا پیچھا کرتے ہوئے اس کا خون کیا۔ جو اسلام میں کسی مسلمان کے ہاتھوں غیر مسلم کا پہلا خون تھا۔ جس پہ رسولؐ آخر سٹ پٹا گئے اور اللہ کے حضور عرض کی، اے اللہ، اس خون سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ آپؐ نے اسی کافر کے خون کا خون بہا دینے کے لئے مسلمان اور یہودیوں سبھی شہریوں سے رابطہ بھی کیا۔ اللہ نے کلام اتارا، پریشان نہ ہو یہ بُری بات سہی مگر جو لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالتے ہیں اور مارتے ہیں وہ اس سے بھی بُری حرکت ہے۔

یہی جعرانہ ہی وہ جگہ ہے، جو جنگ بدر کی وجہ بنی اور حرم سے بائیس کلومیٹر دوری پہ حد ٹھہرائی گئی۔

بات ''نخلہ'' کی ہو رہی تھی۔ جو کعبہ سے ۱۳ کلومیٹر شمال میں ہے۔

جہاں فتح مکہ کے بعد رسولؐ آخر نے خالد بن ولیدؓ کو کچھ سوار دے کر کہا، جاؤ وادی میں بنے مندر میں رکھی ہوئی عزیٰ کی مورتی کو توڑ آؤ۔ جسے کم عقل مشرک، اللہ کی بیٹی کہا کرتے تھے۔

خالد بن ولیدؓ گئے۔ مندر توڑ کر آ گئے۔

پوچھا سرکارِ دو عالم نے، عزیٰ کو توڑا؟

خالد بن ولید بولے، جی سرکار، ہر چیز توڑ دی۔

سرکارِ دو عالم نے سر نفی میں گھمایا۔ فرمانے لگے پھر جاؤ۔ خالدؓ پھر گئے اس بار غصے میں ایسی توڑ پھوڑ کی کہ عزیٰ کی مورتی ریزہ ریزہ ہو گئی۔ پھر اس مورتی کے اندر اک دھماکہ ہوا اور کالے سیاہ دھویں کے مرغولے میں ایک سیاہ فام، بے ہنگم ڈراؤنے چہرے والی

چڑیل اپنے بال کھولے چیخیں مارتی ہوئی نکل کے بھاگی، اور خالد بن ولیدؓ کی ضرب سے کٹ کے گری اور ختم ہوگئی۔ واپس آ کے خالدؓ نے سارا واقعہ سرکارؐ دو عالم کو سنایا تو آپؐ نے تبسم فرمایا اور بولے یہی تھی عزیٰ، ختم ہوگئی۔

یہ سب واقعے تو ہوئے مگر "نخلہ" حرم کعبہ کی حد بننے کی یہ وجہ محسوس ہوتی ہے کہ وادی نخلہ وہ جگہ ہے جہاں خون سے لت پت پاؤں لے کر سرکارؐ دو عالم طائف سے اترے تھے۔ اپنے آزاد کیے ہوئے غلام سیّدنا زیدؓ کے ساتھ اس ٹھنڈے پہاڑی شہر میں گئے تھے، اسی کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کر کے۔ مکہ میں قبیلے کا سرپرستی دینے والے چچا سیّدنا ابوطالب اور غم گسار بیوی خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا تھا۔ سوچا، طائف خوش حال مکہ والوں کے باغات کا شہر ہے۔ قرابت دار ہیں۔ شاید کسی کے دل پہ خدا کے کلام کا اثر ہو۔ وہ ایمان لے آئے۔

پیدل قدم قدم چل کے پہاڑ پہ چڑھ گئے۔

وہاں بے عقل جاہلوں نے پتھر مارے۔

لہولہان کر دیا۔

پہاڑ سے اترتے اترتے وادی نخلہ میں پہنچے۔ خون پیروں پہ جما ہوا تھا۔ سر پہ ڈالی گئی دھول تھی۔ کمر پہ مارے ہوئے پتھروں کے نشان تھے۔ پیچھے شور مچاتے، پتھر مارتے بچوں کا ریلا تھا۔ ریلے کے ساتھ اس بستی کے لوگوں کی حقارت بھری، طنز سے کاٹتی آنکھیں تھیں۔

وادی نخلہ میں پہنچ گئے۔

تو آسمان سے جبرائیل امینؑ، پہاڑ کے فرشتے کو لے کر حاضر ہوگئے۔ بولے، آقا یہ پہاڑوں پہ دسترس والا فرشتہ ہے اور اب آپ کی کمان میں ہے۔ جو کہیں تعمیل ہوگی۔

پہاڑوں کے کمان دار فرشتے نے بڑھ کے سلام کیا اور کہنے لگا، پہاڑوں پہ آپ کی شان مبارک پہ جو گستاخیاں ہوئیں وہ سب خدا نے دیکھیں۔ اس لیے مجھے بھیجا گیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں ابھی ان پہاڑوں کو توڑ کے ان لوگوں پہ گرا دوں جنہوں نے آپ کو زخم دیے۔

نہ نہ۔ سرکارؐ دو عالم زخم زخم تھے۔ جسم سارا زخم بنا ہوا تھا۔

مگر ایک دم ہاتھ اُٹھا کے پہاڑوں کے کمان دار فرشتے سے بولے،

نہیں نہیں کچھ نہ کرو۔

یہ نہیں تو ان کی اولاد ایمان کی دولت سے مالا مال ہوگی۔

تم کچھ نہ کرو۔

جاؤ۔

یہ حد، رحمت اللعالمینؐ کی حد ہے۔

طے یہ سیّدنا ابراہیمؑ پہ ہوئی تھی۔

ثابت اسے دو ہزار سال بعد سیّدنا ابراہیمؑ کی مانگی ہوئی دعا کی تعبیر نے کیا۔

میرے آقا نے کیا۔

☆☆☆☆☆

ذات کا سچ [تلازمات]

تیز دوڑتی اور چیختی ہوئی کاروں کے درمیان
راستہ بناتے ہوئے میں اکثر سڑک پہ رُک
کے ہلاک ہوجانے کی
کوشش کر چکا ہوں۔ لوگ میری کم حیثیتی کو
جانے بغیر
حریص منصفوں سے ڈرتے ہیں
بہت سے لوگ کنگال ہونے کے خوف سے
بے ہودہ گالیاں دے کر مجھے میرے پیچھے
لگائے رکھتے ہیں

.....

ہلکی ہلکی بارش میں ایک بھیگتے پیڑ کی شاخ پر
ایک بہت ہی انوکھا اور خوبصورت پرندہ
بیٹھا دیکھ کر میں نے
قریب جا کر پرندے کی نسل، عمر، عادت
اور نام کے بارے
میں سوچتے سوچتے کسی پرندے کی آواز
نکالنا چاہی تو
میں بھونک پڑا۔ پرندہ غائب ہوگیا۔ اور
میرے پاؤں کیچڑ میں
دھنس گئے۔ پھر مجھے رات دیر تک وہیں رُکنا
پڑا۔ میں اپنے گھر کے
دروازے پہ دستک دینے سے ڈر گیا تھا۔

.....

ایک دن چند لوگوں نے مجھے چھپ
کر دیوتاؤں سے دعائیں مانگتا دیکھ لیا
اور پھر اُنہوں نے میری دُعائیں پسند
کر کے یاد کر لیں
جب میں نے دیکھا کہ میری کی ہوئی
دُعائیں مانگ مانگ کر
ان میں سے بہت سے لوگ خوشحال اور
طاقت ور ہو گئے ہیں
تو میں نے چیخ چیخ کر وہ دعائیں مانگنا
شروع کیں۔ جن کے قبول ہوجانے کی
مجھے کوئی اُمید ہی نہ تھی
زمین پہ فساد پھیلتا گیا۔ لیکن دیوتاؤں نے مجھے
کوئی سزا نہ دی۔ میری کمینگی ان کے لیے
ایک نئی چیز تھی

.....

بھاگتے، ہانپتے ایک آدمی نے مجھے آلیا
اور اپنا خنجر نکالتے ہوئے بولا، سچ بتاؤ تم نے
ہمارے دیوتا
کی شان میں طلوع ہونے والے چاند کو

دیکھ کر کیا دُعا کی ہے
اس کے پیچھے لوگوں کا اک گروہ آ پہنچا۔
ان کی نیت دیکھ کر میں نے عاجزی سے کہا،
مجھے چاند دکھائی نہیں دیا
آؤ ہم سب مل کر چاند دیکھیں اور پھر ایک سی
دُعائیں مانگیں
وہ سب مجھے نرغے میں لے کر اس مقام تک
آئے جہاں سے چاند کو دیکھا گیا تھا
دیوتا کی حمد گاتے ہوئے ہم سب بہت دیر
کھڑے رہے۔ لیکن چاند اوجھل
ہو چکا تھا۔ ہجوم میں سے کسی نے تھک کر کہا۔
دیوتا کی حمد چھوڑ کر
کیوں نہ ہم چاند کے اُبھرنے کی دُعا مانگ لیں۔
یکا یک ہنگامہ برپا ہوگا۔ خنجر چلے اور زمین
خون سے گیلی ہوگئی

.....

اگلے دن میری گواہی رد کرتے ہوئے
منصف نے مجھے جھڑکتے ہوئے کہا
تم دیوتا کے پجاری ہو۔ اور نہ ہی چاند سے
تمہارا کوئی
روحانی رشتہ ہے۔ لہٰذا تمہاری گواہی پہ ہم
بھروسہ نہیں کر سکتے
اب ہر روز مقتولین کے رشتہ دار مجھے راستے
میں روک کر
مجھ سے قاتلوں کے خلاف گواہی لیتے رہتے
ہیں۔ ان میں سب وہی ہیں
جنھوں نے مجھے نرغے میں لے کر چاند
دکھانا چاہا تھا

☆☆☆☆☆

کلیم خارجی

ترازو

شمشاد کے بارے میں محلے داروں کی رائے اچھی نہ تھی۔ جانے کہاں جاتی ہے؟ کیا کرتی ہے؟ حرام کی کمائی'' جانے کیا، کیا اس کے پیچھے کہا جاتا تھا۔ اس کے کانوں میں کب سے ایسے جملے پڑ رہے تھے۔ اندر تک وہ جل کر خاکستر ہو جاتی ۔ مگر .....مگر اس نے کب پرواہ کرنی تھی کرتی بھی کیوں؟ کون اس کے ساتھ تعاون کر رہا تھا۔ کبھی کسی نے دو گھڑی بیٹھ کر اس کے دل کا حال سنا، کیا___

کیوں کرتے وہ اس سے بات۔ اس سے کلام کر کے وہ خود بُرا نہیں بننا چاہتے تھے۔ وہ اونچی لمبی، ٹھسّے دار عورت تھی۔ مضبوط جسم کی مالک۔ اور مضبوط کردار کی حامل۔

2 جوان ہوتی جڑواں بیٹیوں نور اور علینہ کے ساتھ برسوں سے کرائے کے مکان میں رہتی تھی۔ اس کا ذریعہ معاش دور دراز کی کوٹھیوں میں کام کرنا تھا۔ محلّے اور قرب وجوار میں کوئی گھر ایسا نہ تھا، جہاں اسے روزگار ملتا۔

نہ ہی اس علاقے میں اردگرد ایسے گھرانے تھے جو اسے اپنے گھریلو کام کاج کے لیے اپنے گھر میں اُسے رکھ لیتے۔ معمولی محلّہ اور معمولی لوگ تھے۔ اور شمشاد ان معمولی لوگوں سے بھی ان کے نزدیک گئی گزری تھی۔ کس سے شکوہ کرتی جو چند لوگ تھے وہ شمشاد کو پسند نہ کرتے تھے۔ کھلم کھلا اس پر بدکاری کا وار کرتے تھے، تہمتیں لگاتے۔ الزام تراشیاں کرتے۔ کس کس کا منہ بند کرتی'؟ کس کس کی زبان پکڑتی؟ کون تھا جو اس کا سہارا بنتا۔ اس کے لیے تڑپتا، جھگڑتا، اسے شرافت کی سند عطا کرتا؟

کچھ گھروں سے کبھی کبھار دیگی چاول، یا عید بقرعید پر کوئی لفافہ آ جاتا مگر شمشاد کو اپنے گھر کوئی نہ آنے دیتا۔ شمشاد نے خود ہی آنا جانا بند کر دیا۔ کیونکہ اپنی صفائیاں پیش کرتی۔ خطا کار نہ تھی، پھر وضاحتیں کیا دیتی۔ رات کو بستر پر لیٹے لیٹے رب کے حضور آنسوؤں کے نذرانے لٹاتی رہتی۔ اور اچھی امید رکھتی کہ اللہ اس گھور اندھیری رات کے بعد روشنی دکھائے گا۔ تقدیر میں اچھے دن بھی آئیں گے اچھے نین نقش کی عورت شمشاد کی بیٹیاں بھی ماں پر گئی تھی۔ گھر داری میں بھی طاق ہو رہی تھی، سکول میں بھیجنے کے بعد وہ گھر کو تالا لگا کر کام پر چلی جاتی۔ اس کا تالا ہی مشکوک سمجھا جاتا تھا۔ بیٹیوں کے سکول سے آنے سے پہلے وہ گھر آ جاتی۔ ان کو کھانا کھلا کر، پھر کام پر چلی جاتی۔ تالا ہنوز لگا رہتا۔ اتوار کے دن چھٹی ہوتی تو تینوں مل جل کر صفائی کرتی۔ ہفتے بھر کے کپڑے دھلتے، تھکن سے چور جسم جب بستر پر گرتا تو لمحے

فصیحہ آصف خان

بھر میں ہی وہ نیند کی آغوش میں چلی جاتی۔ اس کا ضمیر مطمئن تھا۔ سینے پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ اب فکر تھی تو یہ کہ بیٹیوں کو اچھے، شریف، عزت دار گھر مل جائیں۔ مگر کیسے؟

چھوڑو میاں۔ کام کیا کرتا ہے۔ دھندہ کرتی ہے۔ خان صاحب نے اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے نفرت سے کہا۔ تو قریب کھڑے محمود صاحب نے استغفراللہ کہہ کر دل سے حقارت کا اظہار کیا۔ وہ شمشاد سے نفرت تو کرتے تھے، مگر اس طرح کی غلط بات وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ شمشاد کردار کی ہلکی ہے۔ نہ انھیں کبھی دیکھتے میں ایسا ویسا کچھ نظر آیا۔

مالک مکان سے بھی کوئی شکایت نہ سنی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والی عورت تھی۔ اصل میں مرد کو جب ہڈی نہ ملے تو وہ بھونکنا شروع کر دیتا ہے۔ اور بسا اوقات حملہ بھی کر ڈالتا ہے۔

محلے کے چند مرد بھی انہی کی سوچ رکھتے تھے۔ شمشاد سلام دُعا کرتے گزر جاتی اور وہ ہونٹوں پہ زبان پھیر کر رہ جاتے تھے۔ کسی غیر مرد کو کبھی اس کے دروازے پر نہ دیکھا تھا۔ نہ کوئی سسرالی عزیز آتے؟ انھوں نے اس بیوہ کو گھر سے نکال دیا تھا۔ کیسے اس سے رابطے رکھتے۔ نہ اسے وراثت سے کچھ ملا۔ میکے کا کوئی اتا پتہ نہ تھا۔ جانے کس شہر کی رہنے والی تھی۔

اب چسکہ تھا، مزا تھا جو مل جل کر شمشاد کے کردار کو گندا کر کے حاصل کرتے تھے اور اپنی آخرت تباہ کر رہے تھے۔ مگر انھیں کوئی احساس یا پروا نہ تھی۔ جیسے شمشاد بے پرواہ تھی۔ مشقت میں رات، دن گزار کر گھر چلا رہی تھی۔ کما رہی تھی۔ دونوں بیٹیاں دسویں جماعت میں آ گئی تھیں۔ لڑکے دونوں کو دیکھ کر سیٹیاں بجاتے۔ آہیں بھرتے، مگر وہ کانوں میں تیل ڈال کر گزر جاتیں۔ باپردہ تھیں۔ خاموش رہتیں للچائی نظروں کو نظر انداز کر کے دونوں امتحان دے کر گھر بیٹھ گئیں مگر کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ یہی ماں کی تاکید تھی اب ان کی شادی کی عمریں تھیں۔ مگر کون آئے گا ان کو بیاہنے؟

انہی سوچوں نے شمشاد کا دماغ کھوکھلا کر رکھا تھا۔ رات دن گزر رہے تھے۔ اور اس کی پریشانی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔

آخر ایک دن وہ ہمت کر کے بی بی آمنہ کے پاس چلی آئی۔ اور زاروقطار رو پڑی۔

بی بی آمنہ بھلی خاتون تھیں۔ بچیوں کو قرآن پاک پڑھاتی تھیں۔ نور اور علینہ کو بھی انھوں نے ہی پڑھایا تھا۔ برسوں سے شمشاد کو جانتی تھیں۔ اس کے شب روز سے واقف تھیں۔ محلے دار ان کی عزت و تکریم کرتے تھے۔ شمشاد کو اس طرح بلبلاتا دیکھ کر انھیں بہت تکلیف ہوئی۔

فکر نہ کرو شمشاد اللہ نے تمھاری بیٹیوں کے نصیب میں بہت اچھا فیصلہ لکھا ہوگا۔ بس دعا کیا کرو۔

میں مولوی صاحب سے بات کروں گی۔
اللہ مسبب الاسباب ہے۔ آمنہ کی حلاوت آمیز آواز نے جیسے شمشاد کو اطمینان گھول کر پلا دیا تھا۔
وہ آنسو صاف کرتی گھر آ گئی۔

ارے اسے کون دے گا رشتہ؟ کوئی ہے دل گردے والا جو اس کی بیٹیوں کو بیاہے گا؟ محلے والے طنزیہ ہنستے اور باتیں کرتے۔
سارا دن گھر سے غائب رہتی ہے۔ کیا کرتی ہے؟ حرام کاری کرتی ہوگی۔ بیٹیاں بھی ماں کے نقش قدم پر ہی چلیں گی نا۔ محلے کی عورتیں اکٹھی ہوتیں۔ تو ان کا پسندیدہ موضوع شمشاد کا گھرانہ ہوتا۔ جوان کے نزدیک غلاظت سے لتھڑا ہوا تھا۔ اسی غلاظت کو موضوع بحث بنا کر مزے لیتیں۔
الزامات، بہتان، تہمتیں، جانے کیا، کیا، شمشاد کے دامن میں بھر رہا تھا۔ مگر اسے کب پروا تھی۔ ان گری ہوئی باتوں سے۔ اس کے اندر کوئی چور نہ تھا۔ کیوں ڈرتی، مگر دو بدو جواب بھی نہ دیتی تھی۔ اسے بس بیٹیوں کو اچھے گھروں میں بھیجنا تھا۔ ان کے لیے جوڑ توڑ کرنا تھا، لوگوں کا کام صرف باتیں کرنا تھا۔ دوسروں کی عزتیں اچھالنا تھا۔ شمشاد ان کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ خاموش تھی۔ صابر تھی۔
شکر تھا کہ مالک مکان کسی بہکاوے میں نہ آیا تھا۔ اور نہ اسے مکان خالی کرنے کو کہا تھا حاجی منیب الرحمٰن نیک صفت انسان تھے۔ ان کے نزدیک شمشاد میں کوئی برائی نہ تھی۔ نہ اس کا کردار خراب تھا۔ مگر آزمائش ضرور تھی، پھر بھی وہ رب کا شکر ہی ادا کرتی تھیں۔ حاجی صاحب کبھی کبھار اس کی مدد بھی کر دیتے تھے۔ بجلی اور گیس کے بل اپنی طرف سے ادا کر کے نیکی کما لیتے۔ مگر ان کی بیوی بہت تیز عورت تھی۔ اُس نے شمشاد کو کبھی اپنے گھر میں قدم نہ رکھنے دیا تھا۔ شمشاد نے اسی پہ اکتفا کر لیا تھا۔ ورنہ حاجی صاحب اگر بیوی کے کہنے میں آتے تو وہ کب سے علاقہ بدر ہو چکی ہوتی۔

مولوی امیر الدین اپنی اہلیہ آمنہ بی بی کی بات سن کر سوچنے لگے۔ انھیں بھی معلوم تھا کہ شمشاد کے ساتھ محلے والے کیا رویہ رکھے ہوئے ہیں، مگر وہ چپ تھے۔ لڑکے بہت تنگ کرنے لگے ہیں۔ مدتوں سے یہیں رہ رہی ہے۔ کہاں جائے جوان بچیوں کو لے کر۔ انسانیت تو مر ہی چکی ہے بندوں میں۔ مولوی صاحب شمشاد کی بچیاں بہت نیک، معصوم پاکیزہ اور دیندار ہیں۔ ہم ان کے بچپن سے انھیں جانتے ہیں۔ حمید کی وفات کے بعد شمشاد نے نکاح نہ کیا۔ جوانی بیٹیوں پہ وار دی۔
یہ دنیا والے کسی حال میں جینے نہیں دیتے۔ بی بی آمنہ کے لہجے میں دکھ تھا، احساس تھا۔ ہمارے سامنے رہ رہی ہیں۔ آج تک کوئی ایسی بات نہیں سنی، شمشاد کے بارے میں لوگوں نے کیا کچھ نہ کہا۔ اس کی بیٹیوں کو۔ جانے کب لوگوں کو موت اور قبر یاد آئے گی۔
وہ بہت افسردہ تھیں کافی دیر سے دونوں کے

درمیان خاموشی تھی۔ سوچیں تھیں، تم ٹھیک کہتی ہو، میرے ذہن میں ایک بات آ رہی ہے۔

مولوی صاحب ڈاڑھی کھجاتے ہوئے پرسوچ انداز میں بولے تو آمنہ پوری طرح متوجہ ہوئیں جی کیا۔ وہ ہمہ تن گوش تھیں۔

کیا ہم یہ بیڑہ نہیں اُٹھا سکتے؟ یہ نیکی نہیں کما سکتے؟ یتیم بچیوں کو سہارا نہیں دے سکتے؟

مولوی صاحب کی بات پہ بی بی آمنہ چونکیں کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔ وہ حیرانی سے بولی تھیں۔

ہمارے دونوں بیٹے صادق اور امین ہیں۔ ہم نے انھیں بھی تو پیا ہنا ہے۔ دونوں ماشاءاللہ دکان چلا رہے ہیں۔ برسرروزگار ہیں۔ کیوں نہ ہم شمشاد کی بچیوں کو اپنی بہوئیں بنالیں۔ شوہر کی بات سن کر وہ بے حد حیران ہوئیں کچھ لمحے ساکت بیٹھی رہیں۔ مولوی صاحب پھر بولے۔

اللہ نے ہمیں بیٹی نہیں دی۔ مگر اس میں کوئی خرابی یا برائی نہیں کہ ہم اس رشتے کو بنا کر نبھائیں۔ کیا کہتی ہو تم؟

انھوں نے بُت بنی بی بی آمنہ کو پکارا تو وہ خود کو سنبھال چکی تھیں

آپ، آپ کا فیصلہ اور آرزو منے منظور ہے مولوی صاحب۔

یکدم انھوں نے مجازی خدا کے ہاتھ تھام کر بوسہ دے ڈالا۔

مولوی صاحب کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ آئی تھی۔

زندگی قسمت یوں بدلے گی۔ شمشاد قدرت کی مہربانی پر نہال تھی۔

جس نے اسے فرش سے عرش پہ بٹھا دیا تھا۔ وہی تو تھا جس نے اسے برسوں سے تھام رکھا تھا۔ لڑکھڑاتی تو رب کو پکارتی۔ وہی سہارا دیتا۔ بی بی آمنہ اس کے گھر آئیں تو جیسے شمشاد کو اپنے مقدر پر رشک آنے لگا۔ دونوں بیٹیوں کو اتنا شریف اور پاکیزہ گھرانہ ملے گا۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ وہ سڑی سوکھی نیم تھی جسے بتاشے لگ گئے تھے۔ بی بی آمنہ مٹھائی بھی لائی تھیں۔ منہ میٹھا ہو گیا۔ اگلے دو ماہ کے بعد شادی تھی۔ شمشاد کو سختی سے منع کیا کیا کہ جہیز کے نام پر کچھ نہ لیں گے۔ شادی کی تاریخ بھی رکھ دی، تم اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک اور نور ہمیں دو گی بس اور کچھ نہیں چاہیے۔ بی بی آمنہ نے نور اور علینہ کو ساتھ لگا کر پانچ سو روپے دیئے اور انھیں پیار کیا۔ مٹھائی کھلائی۔ دونوں شرما کر اندر چلی گئیں۔ ابھی کسی سے ذکر نہ کرنا شمشاد، رشک و حسد انسان کے اندر دوڑتا ہے۔ جب وقت آئے گا تو سب کو معلوم ہو جائے گا، بی بی آمنہ نے شمشاد کو تنبیہ کی اور سلام دعا کے بعد چلی گئیں۔

شمشاد خاموشی سے تیاری کرتی رہی کہ شادی کا دن آ گیا۔ دو دن بعد تقریب تھی۔ نکاح اور ولیمہ۔ چند فراد آئے۔ شمشاد کے گھر میں ہی میٹھے چاول بنا لیے تھے۔ مٹھائی بھی منگوالی۔ چائے کا بندوبست بھی تھا۔

پھر دیکھنے اور سننے والوں نے حیرت سے اُنگلیاں دانتوں میں دبالیں، جس گھر کو وہ حقیر سمجھ رہے تھے، آج مولوی امیر الدین نے اس گھر کو آسمان پر بٹھا دیا تھا۔ مقدر کی چمک نے گھر میں اُجالا بکھیر دیا تھا۔ اور شمشاد بیٹیوں کی رخصتی کے بعد سرخرو تھی۔

☆☆☆☆☆

لائف سائز اسکیچ

وہ بھری بہار کے کھلے کھلے دن تھے۔ ہر طرف ہریالی اور پھولوں کی لہک مہک۔ جوانی کی چھایا میں دھڑکتے اور خیال یار کے خمار میں ڈوبے دل، ہمہ دم نت نئے رنگین جذبوں کی ہل چل لیے۔ اسی موسم میں شہر بھر میں دھوم دھڑکے، اور کیوں نہ ہوتے، یہ شادیوں کا سیزن تھا، باراتیں، شادیانے، رنگ بہ رنگ سرسراتے آنچل، قہقہے، ہنسی کی پھلجڑیاں، سجی بنی اور نکھری ہوئی دلہنیں، خوشیوں بھرے اور آرزوئیں جگاتے ہوئے گیت: ''یہ سمے ہے ملن کا سجنی اور سجن کا''۔ ''دلہنیا لے کے جائیں گے''۔ ''دلہنیا روتی مت جانا''۔ شہر میں نئے نئے جوڑے بن رہے تھے۔ گلیوں بازاروں میں سجی سجائی گاڑیاں خوشی سے گلنار بنے جوڑوں کو لیے بھاگ رہی تھیں، اُن کے نئے آشیانوں کی طرف۔

اسد کی گاڑی میں کیسٹ پلیئر پر دلوں کو للچانے والا ایک گیت لگا ہوا تھا:

تجھ سے جو قریب ہے
بڑا خوش نصیب ہے
بڑا خوش نصیب ہے

''ہاں ہو گا کوئی کسی کے قریب، میں تو وہی ہوں اکیلے کا اکیلا، بھرے میلے میں تنہائیوں کا مارا ہوا، ملن کی اس بیلا میں میرا بھلا کیا حصہ''۔

اسد آفس سے نکل کر ڈرائیو کرتا ہوا سیدھا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ گیت سُن کر اس کے کنوارے دل میں کلبلاہٹ ہوئی۔ ''جانے میرا نصیب کب جاگے گا، جاگے گا بھی یا نہیں، یا ہمیشہ کے لیے سو گیا ہے''۔ اس نے بڑے کرب سے سوچا۔ چند منٹ بعد وہ گھر کے اندر تھا، اس نے کپڑے بدلے، چائے کا ایک کپ پیا، دن بھر کی تھکن اس کے بدن سے لپٹی ہوئی تھی، وہ سو گیا۔

جلد ہی دن کی روشنی غائب ہوئی، سرمئی شام پھیلنے لگی۔ پڑوس کے دو تین گھروں میں وہی شادی کے شادیانوں، پٹاخوں اور ہُو ہا کا آغاز۔ اسد کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بیزار ہو کر اُٹھ بیٹھا، کھڑکی کا پردہ سرکا کر آسمان کو دیکھا، سورج خود کو سمیٹ کر مغرب میں جا چھپا تھا، اسے یوں لگا جیسے یہ شام کا دھندلکا نہیں کسی کی منتظر آنکھوں کا گجرا پھیلتا جا رہا ہے اور پورے ماحول کو سوگوار کر رہا ہے۔

''میں یہ شہر ہی کیوں نہ چھوڑ دوں، خواہ چند گھنٹوں کے لیے سہی، یہاں کے تماشوں سے میرا دل مزید تنہائی اور گھبراہٹ کا شکار ہوتا جا

محمد طارق علی

رہا ہے"۔ اس نے گاڑی نکالی اور امی کو بتا کر اسلام آباد کی جانب چل پڑا۔

اسلام آباد میں اس کی خالہ تنہائی کا شکار تھیں، بے اولادی کا دکھ الگ تھا۔ ان دنوں خالو کاروباری سلسلے میں شہر سے باہر تھے۔ وہ شدت سے دوسرا ہٹ کی تمنائی تھیں اور اسد کو ٹیلی فونک بلاوے کئی بار دے چکی تھیں۔ بچپن ہی سے اسد اپنی خالہ سے بہت مانوس تھا اور وہ بھی اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ پورچ میں جب اس کی گاڑی رکی تو وہ باغ باغ ہو گئیں۔ وہ دونوں گئی رات تک آپس میں مختلف موضوعات پر باتیں کرتے اور کیرم کھیلتے رہے۔

صبح اسد کی آنکھ دیر سے کھلی، وہ بھی اُس وقت جب کوئی وزیٹر گھر کی بیل بجاتا ہی چلا گیا۔ خالہ مصلے پر بیٹھی نماز چاشت کے بعد تسبیحات میں مشغول تھیں، آخر اٹھیں، دروازہ کھولا، ان کی سہیلی آمنہ اندر آ گئی، ادھیڑ عمر، عمدہ لباس، خوش گوار طرز گفتگو۔ دونوں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئیں۔ اس وقت تک اسد بھی بیڈ سے اٹھ چکا تھا۔ گھڑی میں گیارہ کا عمل تھا۔ اس نے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا۔ خالہ اور ان کی سہیلی چائے کی پیالی پر باتیں کر رہی تھیں۔

"اے راشدہ بیگم، تم نے میری نادرہ کے لیے ابھی تک کوئی رشتہ نہیں بتایا؟ اور ہاں، یاد آیا، ایک بار تم نے اپنے کسی بھانجے کا ذکر کیا تھا لیکن اس سے آگے پھر کچھ نہ کیا، دکھاؤ نہ اپنے بھانجے کو"۔ مہمان خاتون اپنی پاٹ دار آواز میں بولی۔

خالہ نے انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھ دی۔

"شش، ذرا آہستہ بولو، کل شام میرا بھانجا اسد آ گیا تھا۔ آج اتوار ہے، وہ اس وقت سویا ہوا ہے، ایسا نہ ہو کہ اس کی نیند ٹوٹ جائے۔ ابھی چند منٹ بعد میں اس کے لیے ناشتہ لگاؤں گی، تم اسے دیکھ لینا، نہ صرف دیکھ لینا بلکہ باتیں بھی کر لینا۔"

"ارے واہ! آج تو صبح ہی صبح میرا رشتہ آیا ہے، گویا "بوہنی" اچھی ہو گئی ہے، خالہ جان سے اس وقت کوئی خاتون باتیں کر رہی ہیں اور مجھے دیکھنے دکھانے کا بھی پروگرام بن رہا ہے، جانے یہ کون ہیں اور کیسے لوگ ہیں۔ اسد یہی کچھ سوچتا ہوا باتھ روم میں جا گھسا۔

کھانے کی میز پر اسد کے لیے بڑا پُر تکلف ناشتہ رکھا تھا۔ اس کی پسند کی مختلف اشیا، حلوہ پوری، سری پائے، پراٹھا، دیسی انڈے، چائے وغیرہ۔

"ارے خالہ جی، اتنا کچھ، یہ اہتمام آپ نے کیسے کیا؟" اسد نے پوچھا۔

"حمید، ہمارا نوکر، یہ سب چیزیں آب پارہ مارکیٹ سے لے کر آیا ہے"۔

"لیکن میں تنہا تو اتنا ہیوی ناشتہ نہیں کر سکوں گا"۔

"فکر نہ کرو، میں اور میری یہ عزیز مہمان سہیلی تمھارے ساتھ بیٹھیں گے"۔ اور اسی وقت

انہوں نے اپنی اپنی نشست سنبھال لی۔ اسد نے مہمان خاتون کو مؤدبانہ سلام کیا اور اپنی پلیٹ پر سر جھکا لیا۔ ناشتے کے دوران ہلکے پھلکے موضوعات پر ان کی باہمی گفت گو اور کچھ تعارفی باتیں ہوتی رہیں۔ بعدازاں وہ اٹھ کر بیڈروم میں چلا گیا اور اخبار کا مطالعہ کرنے لگا۔ اسد اپنی عادات واطوار اور شکل وصورت کے لحاظ سے ہزاروں میں نہ سہی تو سینکڑوں میں ایک ضرور تھا۔ وہ آمنہ آنٹی کو بہت پسند آیا، اس بات کی گواہی اُن کی آنکھیں دے رہی تھیں۔

''راشدہ، بڑے افسوس کی بات ہے، تم نے اب تک اپنے اس پیارے سے بھانجے کو مجھ سے کیوں چھپائے رکھا، پہلے کیوں نہ ملایا؟''

''یہ محض اتفاق ہے۔ وہ اچھی عادات کا مالک ہے، اپنی روزمرہ کی زندگی نظم وضبط اور اصول کے ساتھ گزارتا ہے۔ ادھر میری طرف کم کم ہی آتا ہے''۔

''ابھی باتوں کے دوران اسد نے بتایا تھا کہ وہ کسی پرائیویٹ کمپنی میں کام کرتا ہے۔ کونسی کمپنی ہے وہ؟''

''وہ سن رائز انشورنس کمپنی میں اسسٹنٹ منیجر ہے، اپنے اچھے کام اور اچھے اصولوں کی بدولت اس نے خاصی جلدی ترقی حاصل کی ہے، ابھی ان شاء اللہ اور آگے جائے گا''۔ خالہ نے کہا۔

''بھئی! مجھے تو یہ لڑکا بہت پسند ہے۔ میری نادرہ سے اس کی جوڑی اچھی بن سکتی ہے بشرطیکہ تم میری مدد کرو''۔ مہمان خاتون نے کہا۔

''اسد تمہیں پسند ہے، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میری پوری مدد تمہارے ساتھ ہے لیکن فائنل فیصلہ تو وہ اور اس کے والدین ہی کریں گے''۔

''بس راشدہ، اب تم بات آگے چلاؤ، کسی اچھے مرحلے پر میری نادرہ بھی اسے ایک نظر دیکھ لے گی اور یقیناً وہ میری پسند سے اختلاف نہیں کرے گی، گو وہ اپنی ایک خاص سوچ ضرور رکھتی ہے''۔

''ہاں، اللہ نے چاہا تو یہ جوڑ ضرور ہوگا''۔ اسد کی خالہ مسکرائی۔

اور پھر دونوں گھرانوں کے درمیان بات چیت چلی، جھک جھک کر ایک دوسرے کے استقبال ہوئے، کھانے کی پُرتکلف دعوتیں، چند قدم اسد کے والدین اور چند قدم نادرہ کے گھر والے آگے بڑھے، شائستہ اور شگفتہ باتیں اور باتوں کے دوران لڑکی والوں کے بیچ تلے سوالات اور کسی ہیر پھیر کے بغیر لڑکے والوں کے جوابات۔ اور پھر ایک بہت ضروری سوال بھی ہوا۔

''ہاں ایک بات تو ہم پوچھنا بھول ہی گئے تھے، لڑکے کی ماہانہ آمدن کتنی ہے؟''

انہیں پانچ اعداد والا ایک ہندسہ بتا دیا گیا۔ لڑکی والوں نے جواب سن کر سر جھکا لیا، آپس میں مشورے ہوئے اور پھر کھسر پھسر کے انداز میں ایک دوسرے کے کان میں کہا گیا:

''بہتر ہے فیصلہ نادرہ پر چھوڑ دیا جائے اور اس

کے لیے ان دونوں کی ملاقات ضروری ہے، ویسے ایک بات ہے، اس رقم سے کہیں زیادہ تو وہ خود کما لیتی ہے۔''

پھر ایک اتوار کی شام راشدہ آنٹی کے ہاں میلاد کا اہتمام ہوا۔ بہت سے مہمان آئے۔ ان ہی میں اسد، اس کی امی اور نادرہ کے گھر والے بھی تھے۔ اسد کو اس وزٹ کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ آج اس کی ایک خاص ہستی سے ملاقات تھی اور وہ اُس کا بے چینی سے منتظر تھا، کچھ لمحے بے قراری کے، دھڑکتے دل میں اضطراری کے اور پھر ملاقات والا کمرہ اچانک جگمگا اٹھا۔ نادرہ کی صورت میں ایک زمینی چاند اسد اور اس کے گھر والوں کے سامنے تھا۔ مغلئی سے نقوش اور بہت صحیح رنگ والی شخصیت۔ وہ کریم کلر قمیض شلوار اور سبز کاہی رنگ کے دوپٹے میں ملبوس تھی، بہت پُراعتماد اور سوبر شخصیت، لیا دیا سا انداز۔ اسد اُسے دیکھ کر چونکا، پھر گنگ ہو گیا۔

چند منٹ خاموشی میں گزر گئے۔ تاہم دونوں ایک دوسرے کو بہ خوبی پہچان گئے تھے۔ چند سال قبل وہ شہر کے واحد کوایجوکیشن والے کالج میں پڑھتے تھے۔ نادرہ اس سے ایک سال جونیئر تھی۔ وہ پورے کالج میں ایک مغرور اور غصہ ور لڑکی کی حیثیت سے مشہور تھی لیکن اُس کی اس ''مشہوری'' میں چند دل پھینک مگر ناکام عاشقوں کا ہاتھ تھا۔ ویسے کالج میں اس کی شاندار مصوری کا شہرہ تھا اور اس کے علاوہ ایک تیز لسان مقررہ بھی تھی۔ شاید ہی کسی ڈی بیٹ میں وہ ناکام رہی ہو جبکہ اسد ایک اچھے طالب علم اور ایک عمدہ کرکٹر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ تعلیم کے ایک واضح زمانی فرق کی وجہ سے کالج میں وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب نہ تھے، تاہم باہمی واقفیت ضرور تھی۔

لیکن کیا یہ کئی سال پہلے والی باہمی جان کاری اب انہیں ایک کر سکے گی۔ اس کا فیصلہ صرف نادرہ کے ہاتھ میں تھا۔ سو، انہیں ایک علاحدہ ملاقات کا موقع دے دیا گیا۔ وہ لان میں جا کر ٹہلنے لگے۔

''ہماری آج کی ملاقات برسوں بعد بالکل اچانک ہوئی ہے۔ ایک عجیب سے اتفاق کی بہ دولت، میں نے تو ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا، لیکن میں خوش ضرور ہوں''۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں مجھے آپ کی کالج والی شخصیت یاد ہے۔ کالج میں آپ ہمیشہ مغربی لباس میں ملبوس نظر آتے اور آج کی اس اچانک ملاقات میں بھی آپ اسی طرز کے پُرتکلف لباس میں ہیں، کیا آپ بہت مغرب پرست ہیں؟'' نادرہ کا عجیب سا سوال لیکن شگفتہ انداز میں۔

''اس لباس میں آدمی چست اور سمارٹ رہتا ہے''۔

''لیکن کیا پاکستانی لباس آدمی کو سُست اور بھدا بنا دیتا ہے؟'' وہ مسکرائی۔

اسد کئی لمحے خاموش رہا۔ پھر اُس نے سوال کیا:

''آج کل آپ کیا کرتی ہیں؟''

''میں ایک پرائیویٹ آرٹس کالج میں

پڑھاتی ہوں۔ اس کے علاوہ کمرشل مصوری بھی کرتی ہوں"۔

انھوں نے اپنی پسند و ناپسند کے بارے میں چند ایک اور باتیں کیں اور پھر یہ ملاقات ختم ہو گئی۔ کئی دن گزر گئے۔ لڑکی کا فیصلہ کیا ہے؟ سب منتظر تھے۔ آخر ایک دن یہ فیصلہ واضح انکار کی شکل میں سامنے آ گیا۔

"آخر کوئی وجہ؟" لڑکے والوں کا سوال۔

"بس لڑکی کی اپنی مرضی"۔ یہ جواب پا کر لڑکے والے بالخصوص اسد، کافی بددل ہوں گے۔ اس نے کچھ خواب بُن لیے تھے جو بکھر گئے۔ گھر میں خوب باتیں ہوئیں۔

"لڑکی اپنی اچھی صورت پر اتراتی ہے، اس روز بڑی مغرور سی لگ رہی تھی"۔

"انکار کی اصل وجہ اسد کی کم تنخواہ کے علاوہ اور کچھ نہیں، وہ لوگ تو بہت لالچی نکلے"۔

"چلو یہ اچھا ہوا، لڑکی نے اپنی منفی سوچ سے آگاہ کر دیا، بعد میں وہ ہمیں مشکل میں ڈال دیتی"۔

"تو نہیں اور سہی، اب ہم اسد کے لیے ایک ایسی لڑکی تلاش کریں گے جو مخلص ہو"۔

غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ اسد سر جھٹک کر اپنے کام میں لگ گیا لیکن نادرہ کا ٹکا سا جواب اُسے بے چین کر گیا تھا۔ لفظ "شادی" سے اسے نفرت سی ہو گئی تھی۔

ایک دن اسد کو اسی مغرور اور نک چڑھی لڑکی کا خط ڈاک سے اس کے آفس کے پتے پر ملا۔ اس نے کھولا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس خط میں سے ایک کاغذ برآمد ہوا۔ اس پر اسد کا ایک بہت خوب صورت لائف سائز سکیچ بنا ہوا تھا اور اسے مغربی لباس کے بجائے قومی لباس میں دکھایا گیا تھا۔ نیچے لکھا تھا:

"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو آپ اسی لباس میں دلہا بن کر میرے گھر آ سکتے ہیں۔ اس اٹل ارادے کے ساتھ کہ آپ ہمیشہ قومی لباس پہنیں گے اور چہرے پر ایک اچھی تراش والی داڑھی بھی رکھیں گے۔ اب آپ میرے انکار کی اصل وجہ جان گئے ہوں گے۔ نادرہ"۔

پھر بالکل سادہ انداز میں رسمِ رخصتی کے بعد اسد نے اس دل نواز چہرے سے گھونگٹ اٹھایا اور مسکراتے ہوئے بولا: "آداب عرض، آپ کا بنا ہوا لائف سائز سکیچ جیتے جاگتے انداز میں آپ کے سامنے ہے، بتایئے، کیسا لگ رہا ہے؟"

"بہت اچھا"۔ نادرہ مسکرائی۔ "دراصل آپ ایسے مرد کی شان یہی ہے اور میرا آئیڈیل بھی ایسا ہی مرد ہے"۔

"لیکن امتحان کا اتنا جان لیوا انداز کیوں تھا؟"

"میں دیکھنا چاہتی تھی کہ کیا آپ بھی اوروں کی طرح محض میرے چہرے کے پرستار ہیں یا بظاہر میری کسی مشکل سی بات کو بھی اہمیت دے سکتے ہیں؟"

"میرے لیے آپ کے چہرے اور آپ کی بات کی اہمیت تا عمر رہے گی"۔ اور پھر حلاوت آمیز لمحے ان پر جیسے برس پڑے۔

☆☆☆☆☆

دیوار گریہ

مقدس پادریوں نے بتایا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے پاکیزہ دیوار ہے جو کسی کی راہ میں حائل نہیں ہوتی الٹا روح کو پوتر کرتی ہے

اچھا؟؟

مگر ہم نے تو اس کرۂ ارض پر صرف دیوار چین کا سنا ہے یا پھر دیوار برلن کا

اس دیوار کا تو نام ہی نہیں سنا کبھی؟

کیونکہ تم نہ علم لوگ ہو، دنیا کا ہر بڑا دماغ اس دیوار کو جانتا ہے ہر پاک آنکھ اس کے سامنے روتی ہے، اس سے لپٹتی ہے، اسے اپنی نجات دہندہ سمجھتی ہے

کیوں؟

نجات دہندہ کیوں؟

کیا یہ لوگ بہت گناہ گار ہیں؟

معلوم نہیں ، مگر اپنی نایافت کو دریافت کرنے کی جستجو میں اکثر روتے رہتے ہیں

ایسا کیا دریافت کرنا چاہتے ہیں یہ لوگ جو برسہا برس کی ریاضت سے بھی نہیں مل رہا ہے انہیں؟

پتہ نہیں

ویسے تو انسان کی سب سے بڑی ضرورت شناخت ہوتی ہے، کیا ان کی کوئی شناخت نہیں ہے؟

دوسروں سے ایک شناخت اور ایک بستی مانگ کر لی تھی انھوں نے، برسوں پہلے اسی کو اپنا وطن اور اپنی پہچان کہتے ہیں"

بنیادی طور پر سفاک ہیں، اپنے ہی پیغمبروں کو قتل کرتے رہے ہیں... الہامی کتابوں میں ان کی اس سرکشی کا بے پناہ احوال لکھا ہے، انہیں آسمان سے 9 معجزے بھی ملے تھے لیکن انھوں نے اطاعت نہیں کی، قدرت نے بطور سزا انہیں بے گھر کر دیا.. پوری دنیا میں ان کا کوئی وطن نہیں ہے- مانگے کی زمین پر اکڑتے ہیں

ان کے وجود کا مقصد کیا ہے؟

پیغمبروں کے دور کا ایک ہیکل تعمیر کرنا چاہتے ہیں، جو ان سے کہیں کھو گیا ہے

فرخندہ شمیم

وہ اسے دوبارہ بنا کر اپنی نادانیوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں پیشواؤں کی خوشنودی حاصل کرنا اور پیغمبریت کو دوبارہ زمین پر لا کر کرّے پر راج کرنا اب ان کا نصب العین ہے

لیکن ان کے پاس تو خود اپنا کرّہ بھی نہیں ہے، یہ بھلا پوری دنیا پر کیا راج کریں گے؟

اس کے باوجود یہ آدھی دنیا پر قابض ہیں، اپنی بے پناہ دولت اور جدید ترین علوم کی وجہ سے۔

تو پھر اس قدر روتے کیوں رہتے ہیں، وہ بھی ایک بے جان دیوار کے سامنے؟

یہ ان کا عقیدہ ہے

عقیدہ تو ہر مذہب کا ہوتا ہے، لیکن عقلی جواز تو ہو کسی قابل عمل عقیدے کا؟

عقیدوں کے جواز نہیں ہوتے، یہ محض جذباتی اور ہیجانی سوچ کا کرشمہ ہوتے ہیں اب ایسا بھی نہیں، خود بت پرستوں کی عقل بے جان بت سے مانگنا خلاف جواز سمجھتی ہے، اس کے مقابل کسی خیالی اور غیر مرئی وجود سے گفتگو کرنا خلاف عقل نہیں سمجھتی''

اس سے بڑا جواز کیا کہ ایک دیوار کروڑوں سالوں سے بچی ہوئی ہے، اتنے بڑے ہیکل میں سے، یہ امید کی علامت اور کامیابی کی بشارت ہی تو ہے

لیکن کیا اب بھی جن ہی بنائیں گے ہیکل کو؟

سلیمان پیغمبر کے دور میں تو انھوں نے جنوں کو حکم دے کر اسے تعمیر کروایا تھا ناں، اب کون بنائے گا، کیا دیوار کے سامنے رونے والے خود بنائیں گے اس کو؟

تم گریہ کاروں کا مذاق اڑا رہی ہو؟

نہیں

میں رونے والوں کو ان کی پیٹھ کے پیچھے کے مناظر دکھانا چاہتی ہوں، بلڈوزر جہاں انسانوں کی ہڈیاں پیس رہے ہیں، بموں کے ٹکڑے جہاں ننھی گردنوں کو پھاڑ کر زن سے گذر رہے ہیں، ڈرون جہاں شفا خانوں، پناہ گاہوں اور سڑکوں پر پڑی سانسوں کو چاٹ رہے ہیں وہ، جہاں انسانوں کا پانی اور روٹی جھنجھوڑ دی گئی ہے اور کفن کھا لیے گیے ہیں..

یہ فساد کیوں بپا ہے؟

تاریخ بتاتی ہے کہ گریہ کرنے والے اس زمین کے مالک نہیں ہیں یہ کسی اور کی زمین میں آ گھسے ہیں اور ان کی جان سے پیاری مسجد کو ڈھا کر اپنا ہیکل بنانا چاہتے ہیں اس کی جگہ، یہ بے حس قوم ہیں لیکن انہیں اپنی قوت اور اتحاد پر بھروسہ ہے۔

کیا اس دیوار کو کچھ بھی خبر نہیں ہے؟

نہیں، اسے سب پتہ ہے، حق کا بھی اور بے حق کا بھی

مجھے خدشہ ہے یہ رونے پیٹنے والے ماتمی کہیں یہ دعا تو نہیں مانگ رہے کہ انسانوں کو موت دینے والے ہمیشہ زندہ رہیں؟

بالکل ایسا ہی ہے لیکن دیوار گریہ کو سب کی خبر ہے الہامیت دنیا دار نہیں ہوتی، دیوار اگر سچی ہو تو رونے والوں پر ہی آن گرتی ہے،

☆☆☆☆☆

جھرنا

بھوربن میں ایک مہینے کے قیام کے لئے رہائش کا بندوبست ایک مہربان نے کیا تھا۔ راجا انور کامیاب بزنس مین تھے۔ برسوں پہلے کاروبار کی خاطر لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ اب تو ان کا بزنس انگلینڈ تک پھیل چکا تھا لہٰذا ان کا ایک قدم لندن میں ہوتا تھا اور ایک لاہور میں۔ اس کے باوجود گرمی کا سیزن وہ اپنے بھوربن والے بنگلے میں ہی گزارتے تھے۔

ان سے بات ہوئی تو انہوں نے فوراً آفر کر دی کہ میرے بنگلے میں رہو۔ آج کل خالی ہے۔ چناں چہ جب میں بنگلے تک پہنچا تو دور پہاڑوں پر ڈوبتا سورج سرخی بکھیرتا دکھائی دے رہا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ نوازش کو میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی اس نے صفائی وغیرہ کر دی تھی۔ وہ اس بنگلے کا کیئر ٹیکر تھا۔ اس نے میرا بیگ اندر پہنچایا۔ آتش دان میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ میں اس کے ساتھ بنگلے کے مختلف کمروں کا جائزہ لے رہا تھا۔

''صاحب! کچن میں کھانے پینے کا سامان اور گیس سیلنڈر بھی موجود ہے۔ آپ خود چائے وغیرہ بنانا چاہیں تو مسئلہ نہیں ہو گا۔ میں ادھر بنگلے کے ساتھ والے ہٹ میں ہوں گا۔ جب مجھے آواز دیں گے کھانا وغیرہ بنانے کے لئے آجاؤں گا۔'' نوازش نے کہا۔

''او کے۔ مجھے جب بھی ضرورت ہو گی تمہیں بلا لوں گا۔ لیکن ابھی میں آرام کروں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے صاحب؛ آپ آرام کریں میں کھانا بنا لیتا ہوں، آپ کے لئے کیا بناؤں؟''

''کچھ بھی بنا لو، چاول وغیرہ۔'' میں نے چلتے چلتے کہا۔ ہم واپس لاؤنج میں آ گئے تھے۔ سامنے دیوار پر چھ سات برس کی ایک بچی کی تصویر لگی تھی۔ تصویر زندگی سے بھرپور تھی۔ بچی ہنستے ہوئے برف کا گولا کسی کی طرف پھینک رہی تھی پس منظر میں پہاڑوں پر برف نظر آ رہی تھی۔ ''یہ راجا صاحب کی بیٹی کی تصویر ہے۔'' نوازش نے مجھے تصویر کی طرف دیکھتے پایا تو بولا۔

وسیم جبران

''راجا صاحب کی بیٹی تو بڑی ہے؛ کیا یہ اسی کی تصویر ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں صاحب یہ تو پندرہ سولہ برس پہلے کی تصویر ہے۔ نوازش نے بتایا۔'' اوہ تو یہ بات ہے۔ اچھا میں بیڈ روم میں جا رہا ہوں۔ کھانا دو گھنٹے بعد کھاؤں گا۔'' نوازش نے سر ہلا دیا۔ بیڈ پر لیٹ کر میں اپنے مقصد کے بارے میں سوچنے لگا۔ فروری کا مہینہ تھا۔ مجھے مارچ کے دوسرے ہفتے تک یہاں قیام کرنا تھا۔ سوچتے سوچتے اونگھ آ گئی۔ آنکھ کھلی تو وقت دیکھا۔ آٹھ بجے تھے۔ طبیعت کچھ مضمحل تھی۔

بہر حال تازہ دم ہو کر ڈائننگ روم میں آیا۔ کچن سے اشتہا انگیز خوشبو آ رہی تھی۔ چند منٹ بعد نوازش کھانا لے کر آ گیا۔ اس نے پلاؤ کے ساتھ مٹن قورمہ بھی بنا دیا تھا۔ دیگر لوازمات کے ساتھ گرم گرم روٹیاں بھی تھیں۔ میں نے اعتراض کیا کہ اتنے اہتمام کی ضرورت نہیں لیکن نوازش نے بتایا کہ راجا صاحب کی خاص ہدایت ہے کہ کسی طرح کی کوئی کمی نہ ہو۔ میں خاموش ہو گیا۔ کھانے کے بعد نوازش اپنے ہٹ میں چلا گیا اور میں اس بڑے سے بنگلے میں تنہا رہ گیا۔

اپنے کمرے میں جا کر میں نے لیپ ٹاپ کھولا تا کہ کام کا آغاز کروں۔ کافی دیر تک سوچتا رہا کہ آغاز کہاں سے کروں۔ ذہن میں ایک آئیڈیا تھا مگر ابتدا نہیں کر پا رہا تھا۔ راجا صاحب کی بیٹی کے بارے میں سوچنے لگا۔ راجا صاحب نے ایک بار بتایا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے۔ راجا صاحب کی اپنی بیوی سے کبھی نہیں بنی۔ شاید اسی لئے ان کی ساری توجہ بزنس بڑھانے پر مرکوز تھی۔ جب کافی دیر تک کچھ نہ سوجھا تو میں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور بستر پر دراز ہو گیا سوچا اتنی جلدی کیا ہے کل سے سہی۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔

رات بارہ بجے کا وقت ہو گا۔ جب کسی شور سے میری آنکھ کھلی۔ ایک دم ساری حسیات بیدار ہو گئیں۔ رات کے اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ کوئی چور نہ ہو۔ میں پوری طرح الرٹ ہو کر آوازوں کی نوعیت پر غور کرنے لگا۔ کسی کے بولنے کی آواز تھی اور ساتھ برتنوں کی کھنک بھی تھی۔ یہ کوئی اور ہے۔ میں نے سوچا پھر دبے پاؤں آوازوں کی سمت چلا۔ ڈائننگ روم میں دو لوگ موجود تھے۔ وہ کھانا کھا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ بیس بائیس برس کی لڑکی اور اس کا ہم عمر نوجوان۔ میں نے لڑکی کو غور سے دیکھا تو اس کے نقوش تصویر والی بچی جیسے محسوس ہوئے۔ شاید اس نے بھی میری موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا مگر چونکنے کے بجائے کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

''آپ جاگ گئے، دراصل ہم آپ کو

ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتے تھے۔'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ۔ راجا صاحب کی؟''

''ہاں میں ان کی بیٹی ہوں۔ آیئے ناں، آپ کچھ کھائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں میں کھانا کھا چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تو چائے بنا دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''نو تھینکس! میری آنکھ کھلی تو آپ کی آوازیں سن کر ادھر آ گیا۔''

''سوری! اچھا آپ آرام کیجئے میں آپ سے کل تفصیل سے بات کروں گی۔'' وہ جیسے خود مجھ سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اس دوران نوجوان خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ میں نے سر ہلایا اور واپس آ گیا۔ یہ لڑکی بھی عجیب ہے۔ راجا صاحب کو اس بارے میں پتہ نہیں علم ہے یا نہیں۔ میں یہی سوچتے سوچتے ایک بار پھر سو گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو رات کا واقعہ یاد آیا لیکن جب تازہ دم ہو کر واش روم سے نکلا تو سوچ رہا تھا کہ شاید میں نے خواب دیکھا ہے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ راجا صاحب کی بیٹی یوں رات بارہ بجے گھر آئے۔ ناشتے کی میز پر پہنچا تو نوازش نے پھر اہتمام کر رکھا تھا۔ بریڈ، جام، بٹر کے ساتھ پراٹھے اور آملیٹ بھی تھا۔ چائے کافی بھی موجود تھی۔

''صاحب ناشتہ لگا دیا ہے۔ اب میں جاتا ہوں۔'' نوازش یہ کہہ کر چلتا بنا اور میں سوچنے لگا کہ یہ ناشتہ میری ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ نوازش کو منع کرنا چاہیے کہ ضرورت کے مطابق ہی کام کیا کرے۔

ناشتے کا آغاز کرنے ہی والا تھا کہ کسی کی چہکتی آواز سنائی دی۔ ''گڈ مارننگ'' میں نے چونک کر دیکھا۔ راجا صاحب کی بیٹی ڈائننگ روم میں آ گئی تھی۔ ''تم۔؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے خواب نہیں دیکھا تھا۔ اس کی موجودگی ایک حقیقت تھی۔ البتہ اب وہ اکیلی نظر آ رہی تھی نوجوان اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ''آپ اتنے حیران کیوں ہو رہے ہیں، میں نے کہا تھا ناں صبح بات ہو گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بیٹھو'' میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ بات نہیں، وہ لڑکا تمہارے ساتھ نہیں ہے، کیا وہ ناشتہ نہیں کرے گا۔ لڑکی میری بات سن کر جھینپ سی گئی۔ ''نہیں وہ چلا گیا ہے۔ ہم بعد میں اس بارے میں بات کریں گے کیوں کہ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' وہ بولی۔ چناں چہ ہم چپ چاپ ناشتہ کرنے لگے۔ چائے کے کپ لے کر ہم ٹیرس پر آ گئے۔ سن ڈے تھا۔ چمکیلی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو ایسا لگا کہ وہ اپنے بچپن میں جتنی کیوٹ تھی نوجوانی میں اس سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ بلیک جینز کے ساتھ بلیک جیکٹ اور شانوں

پر لہراتے براؤن بال اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے تھے۔ تب مجھے خیال آیا کہ میں نے راجا صاحب سے کبھی ان کی بیٹی کا نام نہیں پوچھا تھا۔

''آپ میرے بارے میں سوچ رہے ہیں ناں، میرا نام جھرنا ہے۔ شاید میرے ابو نے آپ کو میرے بارے میں بتایا ہو۔'' اس نے جیسے میری سوچ پڑھ لی تھی۔ ''بتایا تو تھا مگر نام نہیں بتایا تھا۔ یہ نام کچھ نامانوس سا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن مجھے بہت پسند ہے، مجھے عام چیزیں، عام لوگ اور عام نام اچھے نہیں لگتے۔ میرا نام منفرد ہے اسی لئے مجھے اچھا لگتا ہے۔'' وہ بولی۔ ''تم تو شاید اسلام آباد کی یونیورسٹی میں پڑھتی ہو، پھر یہاں کیوں؟ اور وہ لڑکا؟ کیا وہ تمہارا کلاس فیلو ہے؟''

میرے سوالات پر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ''میں آپ کے سب سوالوں کے جوابات دوں گی۔ فی الوقت صرف اتنا جان لیجیے کہ وہ میرا دوست ہے اور چند دن ہم بھی یہاں رہیں گے۔ وہ ایک ضروری کام سے گیا ہے شام تک آجائے گا لیکن میری آپ سے ایک درخواست ہے براہِ کرم ابھی میرے ابو کو اس بارے میں کچھ نہ بتایئے گا۔'' وہ بے حد سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ میرے لئے یہ بہت مشکل صورتِ حال تھی۔ راجا صاحب میرے مہربان تھے ان کو بتانا میں اپنا فرض سمجھتا تھا لیکن جھرنا کی درخواست رد کرنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بہر حال جھرنا نے کہا تھا کہ ابھی نہ بتایئے یعنی چند دن میں غور کر سکتا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ چناں چہ میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ کہ فی الحال اس حوالے سے خاموش رہوں گا۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں جا رہی ہے ٹی وی وغیرہ دیکھنے۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے بھی اپنا کام کرنا چاہیے لہٰذا کمرے میں آکر لیپ ٹاپ کھولا۔

ایڈیٹر صاحب نے مجھے چھ مہینے کا وقت دیا تھا اور صرف ایک مہینا بچا تھا۔ شہر کے ہنگامے ناول کی تکمیل میں حائل تھے یا کوئی اور وجہ تھی حتمی طور پر میں بھی اس سے لاعلم تھا۔ ایسے میں پھر ناراضی بھری فون کال موصول ہوئی تو میں نے سوچا کہ کسی پرسکون جگہ پر کچھ عرصہ قیام کیا جائے اور پوری یکسوئی سے ناول لکھا جائے۔ اب جھرنا کی موجودگی کیا رخ اختیار کرے گی ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

لکھنے بیٹھا تو لفظ ذہن میں اترنے لگے تین چار گھنٹے گزر گئے اور مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ میرا انہماک اس وقت ٹوٹا جب میرے نتھنوں سے انتہائی مسحور کن خوشبو ٹکرائی۔ جھرنا کمرے میں آئی تھی۔ ''سوری میں بور ہو رہی تھی۔ میں آپ کے کام میں خلل نہیں

ڈالنا چاہتی۔'' اس نے کہا۔ ''نہیں نہیں مجھے بھی بریک کی ضرورت تھی۔ چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ جھرنا خوش ہوگئی۔ ہم باہر نکلے اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پیدل چلتے رہے۔ پہاڑی علاقوں میں جگہ جگہ خوبصورتی بکھری ہوئی ہوتی ہے۔ ہم علاقے کے حسن سے متاثر تھے۔ ایک ریسٹورانٹ نظر آیا تو جھرنا رک گئی۔ مجھے چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ جھرنا کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا اٹھی چناں چہ ہم ریسٹورانٹ میں بیٹھ گئے۔

بیرا ہونق سا آدمی تھا۔ میں نے اسے دو کپ چائے لانے کے لئے کہا تو عجیب سی نظروں سے مجھے تکنے لگا۔ ''لگتا ہے تم بہرے بھی ہو، بھئی چائے لاؤ۔'' میں نے دوبارہ کہا۔ تو جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ جھرنا ہنسنے لگی۔ ہنستے ہوئے وہ بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ میں اس کے دوست کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر جھرنا سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا کہ ابھی اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا لہٰذا خاموش رہا۔ چائے پینے کے بعد ہم واپس آ گئے۔ کچن سے کھانے کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر نوازش کھانا لگانے لگا۔ جھرنا بالکل خاموش سی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے نوازش کی موجودگی میں وہ کمفرٹیبل نہیں تھی۔ میں نے ایک دو بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے جوابات محض ہوں ہاں تک محدود رہے۔

کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے بھی اپنے بیڈروم میں جا کر لکھنا شروع کیا۔ شام ہوئی تو آوازوں سے اندازہ ہوا کہ نوجوان واپس آ گیا ہے۔ اگرچہ کسی کی جاسوسی کرنا اچھی بات نہیں لیکن تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں چپکے سے اپنے کمرے سے نکلا اور آوازوں کا تعاقب کیا۔ آوازیں ٹیرس کی طرف سے آ رہی تھیں۔ میں ایک محفوظ فاصلے سے انہیں دیکھنے لگا۔ وہ خوش گپیوں میں مصروف تھے انہیں آس پاس کی کوئی خبر نہ تھی۔

پھر وہ اندر آ گئے اور لاؤنج میں ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئے۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ ٹی وی محض ایک بہانہ تھا۔ وہ ایک دوسرے کی رفاقت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ صوفے پر اس طرح بیٹھے تھے کہ جھرنا نوجوان کے بازوؤں میں تھی۔ جھرنا کی نظریں ٹی وی پر تھیں جبکہ نوجوان کی توجہ کا مرکز جھرنا تھی۔ پھر جب وہ زیادہ رومینٹک موڈ میں آئے تو میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

رات کے کھانے کے لئے جب ڈائننگ روم میں پہنچا تو وہ دونوں پہلے سے میز پر موجود تھے۔ میں چند رسمی باتوں کے بعد نوجوان کی طرف متوجہ ہوا تو مجھے جھرنا کی

تنہائی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مطلب یہ کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس سے زیادہ بات کروں۔

''جھرنا کھانے کے بعد چائے پیو گی؟'' میں نے پوچھا۔ ہاں میں پیوں گی مگر یہ نہیں بچے گا، یہ رات کو چائے پی لے تو پھر اسے رات بھر نیند نہیں آتی۔ ''جھرنا نے فوراً کہا۔

''کوئی بات نہیں میں جاگ سکتا ہوں۔ میں بھی چائے پیوں گا۔'' نوجوان نے شوخی سے کہا۔ ''میں نے نہیں کہہ دیا ناں، اب چپ رہو۔'' جھرنا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ اسی دوران میں نے محسوس کیا کہ میز کے نیچے اس نے نوجوان کے پاؤں پر پاؤں مارا۔ نوجوان کے منہ سے ایک آواز نکلی۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے فوراً پوچھا۔ کچھ نہیں شاید میرے پاؤں پر کسی کیڑے نے کاٹا ہے۔ نوجوان نے جلدی سے کہا۔ جھرنا پھر اسے گھورنے لگی۔

نوازش کھانا سرو کرنے لگا۔ ''نوازش میاں کھانے کے بعد ہمیں چائے بھی چاہیے، جھرنا بی بی بھی چائے پئیں گی۔'' نوازش نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ''جی کیا کہا صاحب؟''

''چائے بھی بنا لو اب سمجھے۔'' میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ''جی سمجھ گیا'' وہ جلدی سے کچن میں گھس گیا۔ ہم ہنسنے لگے۔ اس رات میں جلدی سو گیا۔ صبح ناشتے پر پھر جھرنا اکیلی تھی نوجوان شاید پھر نکل گیا تھا۔ میں اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم باہر جائیں گے۔ میں نے اس وقت کو ناول لکھنے کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ پھر دو بجے کے قریب جھرنا نے مجھے کمرے میں آ کر کھانے کے لئے بلایا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تو نوازش کھانا لگا کر پانی رکھ رہا تھا۔ مجھے وہ کچھ ڈرا ڈرا سا لگا۔ ہم کھانے کے لئے بیٹھے تو میں نے نوازش سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے میاں کوئی مسئلہ ہے کیا؟''

''کچھ نہیں صاحب! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے فوراً کہا لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ میں نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور کھانا کھانے لگا۔ کھانے کے بعد ہم باہر نکلے۔ آج لمبی واک کا ارادہ تھا۔ پہلے تو اردگرد کے علاقے میں ٹہلتے رہے پھر دیول کی سمت چلنے لگے۔ کافی دور نکل گئے اس دوران ڈھیر ساری باتیں ہوئیں بس ایک مسئلہ تھا کہ جھرنا اپنی ذات کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ میں کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا تو خاموش ہو جاتی۔

واپسی پر معمول کے مطابق ڈنر کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ آج دیر تک لکھنے کا ارادہ تھا۔ شاید گیارہ بجے کا وقت رہا ہو گا

جب ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ چونک کر مڑا تو دل دھک سے رہ گیا۔ جھرنا جانے کب سے بالکل میری کرسی کے پیچھے کھڑی میری تحریر پڑھ رہی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ اور آنکھیں بہت عجیب سی لگ رہی تھیں۔

''جھرنا تم کب آئیں؟ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔'' میں نے شاید خفت مٹانے کے لئے کہا لیکن وہ جھرنا جو بات بات پر مسکراتی تھی بڑی سنجیدہ لگ رہی تھی۔ وہ عجیب سی نظروں سے مجھے گھورتی رہی۔ ایک لفظ نہیں بولی۔

''جھرنا کیا ہوا؟ کچھ تو بولو؟'' میں نے اٹھ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ میری کہانی لکھ رہے ہیں، آپ کیا چاہتے ہیں، مجھے رسوا کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''جھرنا۔ مجھے غلط مت سمجھو۔ میں بس ایک کہانی لکھ رہا ہوں، تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا۔ میں نے نام اور مقام بھی بدل دیا تھا تمہیں---'' میں کچھ اور بھی کہتا لیکن وہ چیخ اٹھی۔

''نہیں یہ میری کہانی ہے۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے اور اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں آپ کے ساتھ کیا کروں گی، آپ بہت پچھتائیں گے مگر تب بہت دیر ہو چکی ہوگی۔'' اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ غصے کی شدت سے کانپ رہی تھی۔

میں اسے تسلی دینے کے لئے اس کی طرف بڑھا تو پھر چیخ اٹھی۔ ''میرے قریب مت آیئے، میں کچھ کر بیٹھوں گی۔''

''دیکھو تم زیادہ جذباتی ہو رہی ہو۔ ہم بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں، ابھی کچھ نہیں بگڑا، تمہیں نہیں لگتا کہ تم اوور ری ایکٹ کر رہی ہو۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ میں ابھی آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی، صبح بات ہوگی۔ وہ پاؤں پٹختے ہوئے چلی گئی۔

میں اس نئی مصیبت کے بارے میں سوچنے لگا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ پھر میں نے راجا صاحب سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

وٹس ایپ کال مل گئی۔ راجا صاحب کی چہکتی آواز سنائی دی تو میں نے گھمبیر لہجے میں کہا کہ راجا صاحب آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ شاید انھوں نے میرے لہجے پر زیادہ غور نہیں کیا اور بولے۔ ''فکر نہ کرو، ساری باتیں کل ہوں گی۔ سوچا تھا تمہیں سرپرائز دوں گا مگر تمہاری کال آ گئی ہے تو بتا دیتا ہوں میں اسلام آباد ائیر پورٹ پر اتر چکا ہوں۔ کل صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی۔'' اب میں اور کیا بات کرتا۔ کال منقطع ہوگئی۔

ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح تیار ہو کر ڈائننگ روم میں آیا تو سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں جھرنا کا موڈ کیسا ہوگا۔ وہ ابھی نہیں آئی تھی۔ نوازش ناشتہ بنا رہا تھا۔ میں کچھ دیر کرسی پر بیٹھا

اس کا انتظار کرتا رہا پھر سوچا کہ اس کے کمرے میں جا کر اسے بلاتا ہوں وہ شدید ناراض تھی۔ اس سے بات کرنا بہت ضروری تھا۔ اٹھ کر اس کے کمرے کی طرف بڑھا دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ دو تین بار دستک دی۔ خاموشی طاری تھی۔

آخر میں نے دستک دیتے ہوئے آواز دی۔

''جھرنا۔۔۔ جھرنا۔ دروازہ کھولو۔'' شاید وہ بہت زیادہ ناراض تھی نہ بول رہی تھی نہ دروازہ کھول رہی تھی۔ اچانک ایک خوفناک خیال آیا کہیں اس نے کچھ کر نہ لیا ہو۔ بے چین ہو کر دروازے کو دھکیلا، دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بیڈ خالی تھا۔ جھرنا وہاں نہیں تھی۔ شاید واش روم میں ہو۔ میں نے واش روم کا دروازہ بجایا اسے آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ واش روم کا دروازہ بھی کھول دیا۔ وہ یہاں بھی نہیں تھی۔ کہاں چلی گئی وہ۔ میں نے پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں اس کی موجودگی کے آثار تک نہ تھے۔ شدید پریشانی کے عالم میں ڈائننگ روم میں آیا تو ناشتہ لگ چکا تھا اور عین اسی وقت ڈور بیل بجی۔

دروازہ کھلا اور راجا صاحب اندر آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ راجا صاحب ہنستے مسکراتے مجھ سے گلے ملے۔ لڑکی نے مجھے سلام کیا۔ میں سلام کا جواب دیا اور راجا صاحب سے کہا کہ مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔ ''تم فون پر بھی یہی کہہ رہے تھے، اب ہم آ گئے ہیں باتیں ہی ہوں گی لیکن تم پریشان لگ رہے ہو ہوا کیا؟'' راجا صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

میں اس قدر پریشان تھا کہ ان کے ساتھ نوجوان لڑکی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے آپ کی بیٹی کے بارے میں بات کرنی ہے۔'' راجا صاحب چونک اٹھے۔

''میری بیٹی کے بارے میں کیا بات کرنی ہے، تم تو اسے کبھی ملے ہی نہیں۔''

''میں آپ کی بیٹی جھرنا سے مل چکا ہوں اور وہ مجھ سے ناراض ہو کر کہیں چلی گئی ہے۔ در اصل میں۔''

''تم کس کی بات کر رہے ہو۔'' راجا صاحب نے میری بات کاٹتے ہوئے شدید حیرت سے کہا۔ ''میری بیٹی تو یہ ہے تمہارے سامنے۔''

میں نے چونک کر اس نوجوان لڑکی کی طرف دیکھا۔ اب غور کیا تو ایسا لگا کہ اس کی شکل بھی اس برف سے کھیلتی بچی کی تصویر جیسی تھی لیکن جھرنا کی طرح خوبصورت نہیں تھی۔

''میں اس کی بات نہیں کر رہا ہوں راجا صاحب! میں جھرنا کی بات کر رہا ہوں۔ آپ کی دوسری بیٹی۔'' میں نے الجھ کر کہا۔

''ابو آپ کی کوئی اور بیٹی بھی ہے؟'' لڑکی بول اٹھی۔ راجا صاحب کی ہنسی کو بریک لگ گئی۔

''تم چپ رہو۔ ہاں تم بتاؤ تم کس جھرنا کی

بات کر رہے ہو۔ کیوں کہ تم جانتے ہو میری ایک ہی بیٹی ہے اور اس کا نام عائشہ ہے۔'' راجا صاحب کی بات سن کر عائشہ بھی سر ہلانے لگی۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں نے نوازش کو آواز دی۔ نوازش ادھر آؤ، بتاؤ ذرا اس کمرے میں کون سی لڑکی رہ رہی تھی۔ وہ جھرنا تھی جس کے لیے تم ناشتہ اور کھانا بھی بناتے رہے ہو۔ یہاں ڈائننگ ٹیبل پر میرے ساتھ ہوتی تھی۔

''صاحب آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔ آپ تو اکیلے ہی رہ رہے تھے۔ میں نے تو آپ کے ساتھ کبھی کسی کو نہیں دیکھا۔'' نوازش نے فوراً کہا اور میرا سر گھوم گیا۔ یہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے۔ شاید جھرنا نے اسے منہ بند رکھنے کے لیے پیسے دیے ہوں۔ میں فوراً دروازے کی طرف بڑھا۔

''کہاں جا رہے ہو، ناشتہ تو کر لو۔'' راجا صاحب نے آواز لگائی لیکن میں نہیں رکا۔ میں جھرنا کو ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ آس پاس جہاں جہاں ہم گئے تھے میں وہاں وہاں اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اچانک کہاں غائب ہو گئی ہے۔ پھر مجھے اس ریسٹورانٹ کا خیال آیا جہاں ہم نے چائے پی تھی۔ امید کی کرن چمکی وہ بیرا تو جھوٹ نہیں بولے گا وہ ضرور بتائے گا۔ میں ریسٹورانٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے پاس موبائل فون بھی ہوتا تھا۔ کاش میں نے جھرنا کی کوئی تصویر ہی بنالی ہوتی۔ خیر میں تیز تیز چلتا ہوا ریسٹورانٹ پہنچا۔

وہ بیرا مجھے فوراً ہی نظر آ گیا۔ ''مجھے پہچانتے ہو؟'' میں نے جاتے ہی سوال کیا۔ ''جی ہاں آپ چند دن پہلے یہاں چائے پینے آئے تھے، دیر تک بیٹھے رہے تھے۔ میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔ ''تو پھر تمہیں وہ لڑکی بھی یاد ہو گی جو اس دن میرے ساتھ تھی۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

''لڑکی؟ نہیں صاحب آپ اکیلے تھے۔'' اس نے کہا اور میرا دماغ بھک سے اڑ گیا یہ بھی انکار کر رہا ہے۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ''دیکھو تم بھول رہے ہو، میرے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔'' میں نے پھر کہا۔ ''نہیں صاحب مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ آپ اکیلے تھے لیکن آپ نے دو کپ چائے منگائی تھی۔ میں اسی لیے تو حیران ہوا تھا۔ جب میں چائے لے کر آیا تھا تو آپ باتیں کر رہے تھے لیکن آپ کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔'' میری پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ جھرنا کون تھی اور کیسے غائب ہو گئی مجھے کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آ رہا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ جھرنا مجھے کبھی نہیں ملے گی۔ میں نے کرسی کا سہارا لیتے ہوئے بیرے سے کہا۔ ''میرے لیے چائے لے آؤ۔''

☆☆☆☆☆

اُنس

سائرہ بچپن سے ہی گھر میں پالے جانے والے جانوروں (بھیڑ بکریوں) سے مانوس تھی۔ اسی طرح اس کے کھیلنے کودنے کے دنوں میں بھی وہ دوسری بچیوں کی طرح گڑیوں اور گیند وغیرہ کی نسبت زیادہ وقت ان بھیڑ بکریوں کے بچوں میں گھسی رہتی اور ایک طرح سے ان کو اپنا دوست اور سہیلی خیال کرتی تھی۔ ایسے ہی دنوں میں ایک دن جب وہ صبح اٹھی تو اس کی والدہ نے اسے بتایا کہ ہماری گھریلو بھیڑ نے آج صبح سویرے ایک بچے کو جنم دیا ہے۔ جو انتہائی خوبصورت اور صحت مند ہے۔ سائرہ نے جیسے ہی یہ خبر سنی تو وہ فوراً بکریوں کے ڈربے کی طرف بھاگی۔ اور فوراً بھاگ کر اس بھیڑ کے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ اب تو گویا سائرہ کے لئے یہ بھیڑ کا بچہ ایک اہم ذمہ داری بن گیا۔ کبھی اس کو چھاؤں میں لے جا رہی ہے تو کبھی اس کو اس کی ماں کا دودھ پلوا رہی ہے۔ کبھی اُسے اٹھا کر چارپائی پر بیٹھی ہے تو کبھی اسے اپنے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے پکڑ کر بیٹھی ہے۔ کبھی اس کو دوڑا کر خوش ہو رہی ہے تو کبھی ایک روٹی کا ٹکڑا اس کے آگے پکڑ کر اسے اپنے پیچھے چلنے کا ہنر سکھا رہی ہے۔ کبھی اس کو نرم رسیوں سے باندھ رہی ہے تو کبھی گھر سے باہر کھلی فضا میں چھوڑ کر اس کا تماشا دیکھ رہی ہے۔ اس طرح نہ صرف سائرہ بلکہ بھیڑ کا بچہ بھی اب سائرہ سے اچھا خاصا مانوس ہو گیا تھا۔ اور یہاں تک کہ جب اسے سائرہ گھر میں نظر نہ آتی تو وہ زور زور سے منمنانا شروع ہو جاتا۔ جیسے اپنے مخصوص لہجے میں سائرہ کو آواز دے رہا ہو۔ سائرہ بھی اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے بھیڑ کے بچے کو ہی اپنی مصروفیت کا محور و مرکز بنائے رکھتی تھی۔

محمد شفیق

دن گزرتے گزرتے سائرہ بھی اپنی جوانی کی دہلیز کے قریب تھی اور بھیڑ کا بچہ بھی ماں کے دودھ کے بعد اب گھاس پر آ گیا تھا۔ اور اچھا خاصا اونچا اور موٹا تازہ ہو گیا تھا۔

کیونکہ سائرہ اسے نہ صرف گھاس وغیرہ کی کمی محسوس ہونے دیتی، بلکہ گھر میں بچنے والی خشک روٹی اور دوسری چیزیں بھی پانی میں بھگو بھگو کر اس بھیڑ کے بچے کو جو اب کافی حد تک کسی بڑے دنبے سے مشابہ ہو گیا تھا کو دیتی۔ جس سے اس کی صحت مزید اچھی ہوتی گئی۔ اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ اب تمام گھر والے اور رشتہ دار اس بھیڑ کے بچے کو خوبصورت اور موٹا تازہ دنبہ دیکھتے تو سائرہ کی خدمت اور محبت کی داد دیے بنا نہ رہ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی سہیلیاں بھی اسے اس دنبے کی وجہ سے کئی دفعہ طنز اور مزاح کا نشانہ بناتیں۔ سائرہ جس کا بڑا خوبصورتی سے جواب دیتی کہ جب مغرب کی عورتیں کتے پال سکتی ہیں تو میں ایک حلال جانور کی خدمت کیوں نہیں کر سکتی۔ بھیڑ کے اس جوان دنبے اور سائرہ کا اُنس اپنی مثال آپ تھا۔ اب سائرہ جہاں بھی گلی محلے یا رشتہ داروں کے گھر جو اس کے گھر کے قریب تھے جاتی تو دنبہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہوتا۔

کئی مرتبہ تو اس کی ماں نے بھی اسے اس معاملے پر ڈانٹا تھا۔ مگر سائرہ تھی کہ کسی طرح بھی اس دنبے سے الگ نہ ہوتی۔ ایسے ہی دن گزرتے گزرتے سائرہ کے ماموں نے سائرہ کا رشتہ اپنے بیٹے صارم کے لیے مانگ لیا۔ جس کی تعلیمی قابلیت کو دیکھتے ہوئے اور قریبی رشتے کی بنا پر سائرہ کے والدین نے رشتے کے لئے ہاں کر دی تھی۔ اب ہر وقت گھر میں سائرہ اور صارم کے رشتے کی باتیں ہوتیں۔ گھر میں ہر طرف خوشی کا سماں پھیلا ہوا تھا۔ مگر سائرہ کو جب بھی اپنے اس دنبے سے جدائی کا خیال آتا تو اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے۔ گھر والے سمجھتے کہ شاید اسے یہ رشتہ منظور نہیں یا گھر سے جدائی کی وجہ سے سائرہ پریشان رہتی ہے۔ بلکہ کئی دفعہ اس کی ماں نے اس سے صیغہ راز میں بات بھی کی کہ اگر وہ کہیں اور شادی کے لئے ہاں کہے تو ابھی ہم اس کے ماموں کو تمھاری شادی کے لئے ہاں نہیں کرتے۔ اسی طرح سائرہ کی والدہ نے اس کی چند ایک سہیلیوں سے بھی اس کے اس ماموں زاد رشتے کے بارے میں دریافت کیا کہ کہیں سائرہ کا کسی اور جگہ شادی کا خیال تو نہیں یا سائرہ اپنے ماموں زاد صارم کو ناپسند تو نہیں کرتی۔ مگر اس کی سہیلیاں سائرہ کے معاملے میں اس کی والدہ کو یقین دلاتیں کہ سائرہ اس رشتے کو ناپسند نہیں کرتی اور نہ ہی وہ کسی اور جگہ شادی کی خواہش مند ہے۔ اسے تو بس ایک ہی فکر کھائے جا رہی ہے کہ وہ اپنے اس پالتو دنبے سے جدا ہو جائے گی۔ اس لئے وہ اب ہر وقت رونے شروع

ہوجاتی ہے۔ جب سائرہ کا والد یہ باتیں سنتا ہے تو وہ اس کی والدہ سے کہتا ہے کہ میں اس دنبے کو بیچ دیتا ہوں۔ جس کی وجہ سے سائرہ ہر وقت مغموم رہتی ہے۔ جب یہ بات سائرہ کے کانوں تک پہنچتی ہے تو سائرہ کہتی ہے خدا کے لئے میرے دنبے کو نہ بیچیں۔ اس کی والدہ اسے کہتی ہے کہ لوگ کیا سوچیں گے کہ تم اس شادی سے خوش نہیں ہو یا کسی اور پریشانی میں مبتلا ہو۔ سائرہ اپنی والدہ کو گلے لگا کر کہتی ہے ماں میں صرف اپنے دنبے سے الگ نہیں ہونا چاہتی۔

اس لئے پریشان ہوں اور کوئی وجہ نہیں ہے۔

بڑی منت سماجت کے ساتھ سائرہ کا والد اسی شرط پر اس دنبے کو فروخت کرنے کا ارادہ ترک کرتا ہے کہ اب سائرہ اسے پریشان یا روتی ہوئی دکھائی نہیں دے گی۔ اسی طرح کچھ ماہ بعد سائرہ کی شادی اپنے ماموں کے گھر ہو جاتی ہے۔ اور شادی والے دن اتنی گہما گہمی میں بھی سائرہ کئی مرتبہ سہیلیوں کے جھرمٹ سے نکل کر خاموشی سے اپنے دنبے کو نہ صرف دیکھ جاتی ہے بلکہ ایک دو مرتبہ اس کے آگے ہری ہری گھاس بھی ڈال جاتی ہے۔ اس تمام صورت حال کو دیکھ کر اس کی سہیلیاں اس کا خوب مذاق اڑاتی ہیں۔ شادی کے دوسرے دن جب وہ دوبارہ اپنے میکے آتی ہے تو سیدھا جانوروں والے ڈربے کی طرف بھاگ کر جاتی ہے اور اس دنبے کو گلے لگا لیتی ہے۔ اس کا ماموں اور شوہر صارم یہ منظر دیکھ کر بہت لطف اندوز ہوتے ہیں کہ کس طرح ایک نئی نویلی دلہن ایک بھیڑ کے بچے سے گلے لگی ہوئی ہے۔ سائرہ کی ماں انہیں ہنس ہنس کر یہ بتاتی ہے کہ کس طرح سائرہ اور بھیڑ کا بچہ آپس میں بچپن سے ایک دوسرے سے مانوس ہیں۔ میکے میں آنے کے بعد سائرہ کا زیادہ تر وقت اپنے دنبے کے ساتھ گزرتا ہے اور جب وہ اپنے سسرال چلی جاتی ہے تو یہاں وہ اداس ہوجاتی ہے۔ وہاں اس کا پالتو اور مانوس دنبہ بھی اس کے بغیر کبھی گھاس نہیں کھاتا تو کبھی خاموشی سے بیٹھا رہتا ہے۔

جیسے وہ دل ہی دل میں سائرہ کو یاد کر رہا ہو۔ اور کبھی کبھی تو وہ ایسے دردناک اور سریلے آواز میں منمناتا جیسے زبان حال سے سائرہ کو آواز دے رہا ہو اور اسے بار بار اپنے پاس آنے کے لئے بلا رہا ہو۔ جب کبھی سائرہ اپنے میکے آتی تو دنبہ اسے دیکھ کر ایسے رسی توڑنے اور مچلنے لگتا جیسے اسے شدید بھوک میں کسی نے ہری ہری گھاس کے کھیت میں چھوڑ دیا ہو۔ اسی طرح دنوں کے گزرنے کے ساتھ ساتھ دنبہ اب کمزور ہونے لگ گیا تھا۔ جب سائرہ کا میکے آنے کا دورانیہ بڑھنے لگا تو دنبے کا گدرایا ہوا جسم گھل کر دبلا ہونے لگا۔ اسے اب نہ گھاس میں دلچسپی تھی اور نہ شرارتوں میں۔ آہستہ آہستہ دنبے کی کمزوری نے تمام گھر والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اور ایک دن تو

دنبے کو بیٹھا ہوا دیکھ کر سائرہ کے والد جیسے سخت دل آدمی کو بھی اس پر رحم آ گیا اور بیٹھے بیٹھے وہ اپنی بیٹی سائرہ کی گھر کی طرف چل پڑا۔ سائرہ اپنے باپ کو یوں دیکھ کر خوش تو بہت ہوئی مگر بعد میں اس کے چہرے پر پریشانی چھانے لگی کہ خیر ہو آج میرا باپ بغیر بتائے اور بغیر کسی وجہ کے ہمارے گھر آ گیا ہے کہیں میری ماں کو تو کچھ نہیں ہوا۔ گھر کے سب لوگ تو باخیریت ہیں۔ ایسے وسوسے اس کے دل میں پیدا ہونے لگے اور جلد ہی اس نے اپنے باپ سے آنے کا مقصد انتہائی بے چینی کے عالم میں پوچھا۔ جس کا جواب اس کے باپ نے بڑے تحمل سے دیا کہ اللہ پاک کا فضل ہے۔ گھر میں سب خیریت ہے اور میں یونہی تم سے ملنے چلا آیا ہوں۔ کچھ دیر بیٹھنے اور چائے پانی پینے کے بعد اس نے سائرہ کی ساس سے کہا۔ بہن اگر آپ کی اجازت ہو تو میں سائرہ کو ایک دو دن کے لئے اپنے گھر لے جاؤں۔ سائرہ کی ساس نے کہا بھائی صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں سائرہ آپ کی بیٹی ہے اور آپ اس کے باپ ہیں۔ بھلا آپ کو اس کے معاملے میں کسی سے اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ سائرہ کے باپ نے کہا بہن خدا تمہیں عزت دے۔ آپ کی بات ٹھیک ہے لیکن ہم مشرقی لوگ شادی کے بعد اپنی بیٹی پر تمام حق اس کے مجازی خدا اور سسرال کا سمجھتے ہیں۔ اس لئے میں نے کہا کہ صارم بیٹے سے یا ان کے نہ ہونے کی صورت میں آپ سے یا بھائی صاحب سے اجازت لے لوں گا۔ جس پر سائرہ کی ساس نے کہا بھائی صاحب سائرہ کو ابھی میں تیار کرواتی ہوں اور صارم کو بھی میں اطلاع کر دوں گی۔ آپ خوشی سے سائرہ کو لے جائیں۔ اور ساتھ ہی سائرہ کو اس کی ساس نے تیار ہونے کا کہہ دیا اور چند لمحوں کے بعد وہ باپ بیٹی وہاں سے اپنے گھر کے لئے چل پڑے۔ راستے میں سائرہ بار بار اپنے باپ سے اس طرح اس کے گھر آنے اور اسے اپنے ساتھ میکے لانے کا پوچھتی رہی۔ اور بلآخر مجبور ہو کر اس کے باپ نے اسے بتایا کہ آج دو چار روز ہو گئے ہیں تمہارا دنبہ کچھ بیمار سا لگتا تھا۔ اس لئے آج جب میں نے اس کو بہت پریشان دیکھا تو سوچا کیوں نہ اس کی پریشانی دور کرنے کے لئے تمہیں اس سے ملایا جائے۔ اور اسی پریشانی میں میں اس بے زبان کی محبت اور تم سے اُنس کو دیکھتے ہوئے تمہیں لینے چلا آیا۔ یہ سن کر سائرہ کا دل بھی پسیج گیا۔ اور وہ بھی اپنے دنبے کے لئے پریشان ہو گئی۔ اور اپنے باپ سے کہنے لگی کہ بابا چلو جلدی گھر چلو۔ میں اپنے دنبے کو ان شاء اللہ تندرست کر دوں گی اور واقعی ایسا ہوا جب سائرہ اور اس کا والد گھر پہنچے تو دنبہ سائرہ کو دیکھ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ نہ صرف اٹھ کھڑا ہوا بلکہ اس نے منمنانا اور اپنی دم کو ہلانا بھی شروع کر دیا جیسے گویا وہ سائرہ کو دیکھ کر خوشی منا رہا

ہو۔دنبے کو اس طرح مچلتا دیکھ کر سائرہ کے والد کو بھی خوشی ہونے لگی کہ واقعی یہ میں نے اچھا کیا جو سائرہ کو لینے چلا گیا۔ سائرہ نے بھی آتے ہی فوراً دنبے کی کھرلی سنبھالی اور دنبے کے آگے ہری ہری گھاس ڈال کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگی اور دنبہ بھی خوشی خوشی گھاس کھانے اور ادھر اُدھر اُچھلنے کودنے شروع ہو گیا۔ سائرہ کی ماں بھی یہ منظر دیکھ کر نہ صرف حیران ہوئی بلکہ اسے یہ بھی یقین ہو گیا کہ انسانوں کی طرح ان جانوروں کو بھی اُنس اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ سائرہ نے اپنے دنبے کی خبر لینے کے بعد اپنی امی اور گھر کے دوسرے لوگوں سے حال احوال بانٹا۔ اور اپنے خوشحال ازدواجی زندگی کا بھی بتایا کہ کس طرح ماموں زاد صارم اس کا خیال رکھتا ہے۔ اور سب گھر والے ماموں ممانی بھی اس کے ساتھ اپنے گھر کے فرد اور اپنے بچوں جیسا سلوک کرتے ہیں ۔ لیکن جب بھی مجھے میرے دنبے کی یاد آتی ہے تو میں بھی اپنے دنبے کے لئے اسی طرح پریشان ہو جاتی ہوں جس طرح کہ میرا دنبہ۔ شام کے کھانے پر جب سب گھر والے اکٹھے بیٹھے تھے تو سائرہ کے ابو نے کہا بیٹا جب ایک دو دن کے بعد تم پھر سسرال چلی جاؤ گی تو یہ دنبہ پھر اداس اور بیمار رہنے لگے گا۔ سائرہ نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا کہ جی ابا یہ تو ہے۔ تو اس دوران اس کی والدہ نے کہا کیوں نہ ہم اس دنبے کو بیچ دیں۔ دوسرے گھر جا کر خود بخود سائرہ کو بھول جائے گا اس پر سائرہ کے ابو نے کہا سائرہ کی ماں یہ تو ایک دھوکہ ہوا۔ جب سائرہ کے بغیر یہ ہمارے گھر جہاں وہ پیدا ہوا ہے خوش نہیں رہ سکتا تو کسی دوسرے گھر کیسے زندہ رہ سکے گا۔ بلکہ وہاں تو بیمار رہ کر مر جائے گا۔ کیوں نہ ہم اس کا صدقہ کر کے اس کا گوشت غریبوں میں بانٹ دیں۔ اس بات پر سائرہ نے فوراً رونا شروع کر دیا کہ ابا جان میرے جیتے جی آپ اس دنبے کو ذبح نہ کریں۔ یہ بے چارہ بے زبان اور مجھ سے اس کا یوں ذبح ہونا برداشت نہیں ہوگا۔ تو اس پر سائرہ کے ابا نے کہا بیٹا اب تم بتاؤ پھر کیا کریں۔ تم روز روز تو سسرال کو چھوڑ کر یہاں اس کے لئے نہیں آسکتیں۔ یہ ساری باتیں جب ہو رہی تھیں تو سائرہ کے بھائی نے کہا میرے پاس اس مسئلے کا حل ہے۔ سب نے یکبارگی اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا کیوں نہ ہم یہ دنبہ سائرہ باجی کو ہی دے دیں۔ اور یہ انھیں اپنے گھر رکھے۔ اس طرح دنبہ ذبح بھی نہیں ہوگا اور سائرہ باجی اور دنبہ ایک دوسرے سے جدا بھی نہیں ہوں گے۔ سب گھر والوں نے اس کی اس تجویز کو بہت پسند کیا اور جب اگلے دن سائرہ کو اس کا بھائی اس کے سسرال چھوڑنے جا رہا تھا تو سائرہ کا دنبہ بھی خوشی خوشی ان کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

غزل

در بہ در گریہ کناں ، طالب درماں کیوں ہیں؟
تیرے عشاق گرفتارِ غمِ جاں کیوں ہیں؟

مدح کے باب میں بھی ہم رہے محتاج نوا!
تیرے مدّاح اسیرِ سر و ساماں کیوں ہیں؟

نم یہ آنکھیں بھی نہیں ! ہم بھی گلوگیر نہیں!
آج تارے بھی دھواں، اے صف مژگاں کیوں ہیں؟

اے مہِ شہرِ تمنا ! دل ویراں میں دمک
دیکھ ہم چشم کشا مثلِ بیاباں کیوں ہیں؟

کس طرف دیکھیں پئے اذن حضوری ، آقا!
ترے چاکر، ترے درباں، تہی داماں کیوں ہیں؟

عجز تک ہم کو تری شان کے شایاں نہ ملا!
اتنے کم مایہ فقط تیرے ثنا خواں کیوں ہیں؟

خالد احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دم سادھ کے دیکھوں تجھے ، جھپکوں نہ پلک بھی
آنکھوں میں سمولوں، ترے لہجے کی دمک بھی

غزل

صرصر کو لوگ باد صبا ماننے لگے
ذرے کو آفتاب کہا، ماننے لگے

لازم ہوا ہے جب سے یہاں احترامِ شب
ظلمت کو لوگ رب کی رضا ماننے لگے

ظاہر کا خوف پھیل کے باطن پہ چھا گیا
ہم اپنی زندگی کو سزا ماننے لگے

دن میں بھی چل رہا ہے یہاں کاروبارِ شب
کھوٹے کو لوگ جب سے کھرا ماننے لگے

اک پل میں اتنے رنگ بدلتی ہے زندگی
اب کیا کوئی ہرے کو ہرا ماننے لگے

آنکھیں کھلی ہیں ذہنِ رسا بھی ہے جس کے پاس
کیسے وہ ہر کسی کا کہا مانتے لگے

ہر حکم پر کیا سرِ تسلیم خم مگر
ایسا نہیں کہ دل کو خدا ماننے لگے

کیسے کٹے گا شب کا سفر ہم اگر کنور
ماچس کی تیلیوں کو دیا ماننے لگے

اعجاز کنور راجہ

غزل

مَیں کیا بتاؤں کہاں مُجھ کو ہونا چاہیے تھا
وہاں نہیں ہوں جہاں مُجھ کو ہونا چاہیے تھا

سوال مجھ سے ہُوا ہے، مَیں کیوں نہیں ہوں وہاں
جواب یہ ہے کہ ہاں، مُجھ کو ہونا چاہیے تھا

یہ میرے عہد کی اَرزانیوں نے ظلم کیا
وگرنہ اَور گراں مُجھ کو ہونا چاہیے تھا

چلا تھا شوق سے جب منزلِ یقیں کی طرف
ورائے وہم و گماں مُجھ کو ہونا چاہیے تھا

بڑی شدید تھی خاموشی صحنِ مسجد کی
وہاں بوقتِ اذاں مُجھ کو ہونا چاہیے تھا

قدم قدم پہ بھٹکنے کا خطرہ تھا لاحق
سو اپنا بھی نگراں مُجھ کو ہونا چاہیے تھا

اگر یہ لازمی تھا اپنا احتساب کروں
ملالِ سود و زیاں مُجھ کو ہونا چاہیے تھا

نہاں میں رہنا ہی ترجیح تھی مری، پھر بھی
کبھی کبھی تو عیاں مُجھ کو ہونا چاہیے تھا

الاؤ بُجھ بھی چکا تھا اگر نسیمِ سحر
بلند ہوتا دھواں مُجھ کو ہونا چاہیے تھا

نسیمِ سحر

غزلیں

دوستی اس سے ہوئی اور نبھائی نہ گئی
ایک دیوار تھی حائل جو گرائی نہ گئی

میری گفتار میں سو عیب نکالے اس نے
مرے کردار پہ انگلی تو اٹھائی نہ گئی

کوئی بتلائے اندھیرے میں قدم کیسے اُٹھے
مشعلِ غم تو سر راہ جلائی نہ گئی

جس کا ہر فرد محبت کی زباں جانتا ہو
ایک بستی بھی کہیں ایسی نبھائی نہ گئی

میرا بچپن مری نظروں سے رہے گا اوجھل
کوئی تصویر ہی جب مجھ کو دکھائی نہ گئی

جو بھی لکھا ہے فرشتوں نے اسے سب نے مانا
ان کی تحریر کبھی مجھ سے پڑھائی نہ گئی

التفات اس کا شبِ وصل رہا یاد حسن
بے رخی وقت سحر اس کی بھلائی نہ گئی

حسن عسکری کاظمی

تمثیل میں مل جائے گا کردار مجھے بھی
فطرت کبھی بخشے گی وہ معیار مجھے بھی
جنگاہ میں قبضے پہ رہے میرا تصرف
دے ہاتھ میں اک روز وہ تلوار مجھے بھی
وہ شخص تصور میں مجھے اپنا بنالے
کر لے وہی چاہت میں گرفتار مجھے بھی
وہ میرا ہے مجھ سے وہ جدا ہو نہیں سکتا
جیسا ہے اسے مجھ سے وہی پیار مجھے بھی
دیکھوں میں جمالِ راہِ ادراک فلک پر
حاصل ہو اگر دیدۂ بیدار مجھے بھی

نظروں سے گرایا مرے اجداد نے اس کو
دنیا سے نہیں کوئی سروکار مجھے بھی
تعمیر میں تخریب کا پہلو بھی چھپا ہے
کر دے نہ کشاکش کہیں مسمار مجھے بھی
دستک نہ درِ یار پہ دینے کی خواہش
"کب توڑ کے رکھ دے مرا پندار مجھے بھی"

غزل

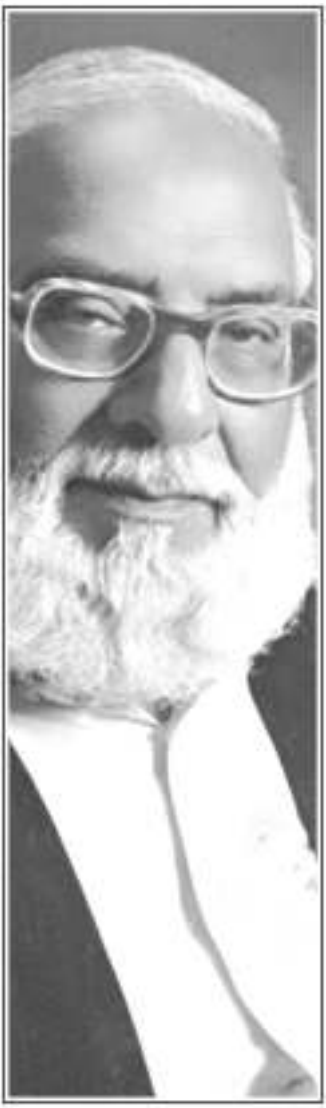

قلب و جاں پر کوئی زوال نہ ہو
اے خدا گھر یہ پائمال نہ ہو

زندہ رہنا ہے دوریوں میں بھی
مر نہ جائیں اگر وصال نہ ہو

ہے یہ اچھا کہ خود پہ کھل جائیں
غمِ دنیا کا احتمال نہ ہو

ہے تمنا خود آگہی سے جئیں
سرنگوں ہو کے کچھ سوال نہ ہو

عہدِ ماضی کہ حال مستقبل
بے اماں کوئی ماہ و سال نہ ہو

چشمِ حیراں ہو چار سو نگراں
زخم وہ جس کا اندمال نہ ہو

آن قائم رہے بہر صورت
جان جائے تو کچھ ملال نہ ہو

سیّد ریاض حسین زیدی

غزلیں

یوں بہاروں کو سزا دیتے ہیں لوگ
سبز شاخوں کو جلا دیتے ہیں لوگ

تاکہ اک طوفاں اُٹھایا جا سکے
بات کو کتنی ہوا دیتے ہیں لوگ

اک اچھوتا وار کرنے کے لیے
ہاتھ سے خنجر گرا دیتے ہیں لوگ

مدعی کا خوں بھی لے لیتے ہیں سر
کب کسی کو خوں بہا دیتے ہیں لوگ

دیدنی ہے مصلحت کی انتہا
مسئلے زندہ دبا دیتے ہیں لوگ

پھاند کر پرواز سناٹے کی حد
گاہے گاہے سر کٹا دیتے ہیں لوگ

یعقوب پرواز

ہنستے ہیں لوگ ہم سے ہی کیسا مذاق ہے
بس اور کچھ نہیں تری دنیا مذاق ہے

ریگِ رواں سے اب اسے موسوم کیجیے
اک عمر سے جو خشک ہے دریا، مذاق ہے

انسان ہوں اگر تو فرشتہ نہ کہہ مجھے
انسانیت کے ساتھ یہ بھونڈا مذاق ہے

اُس سے اُسی کو مانگنا مہنگا پڑا مجھے
جس نے کہا کہ میری تمنا مذاق ہے

عمرِ عزیز کٹ گئی اُس کے فراق میں
جس کی نظر میں وصل کا لمحہ مذاق ہے

جس پر نگاہ خاص رہی ہے تمام عمر
وہ بھی مرے خلوص کو سمجھا مذاق ہے

جس کی گھنیری چھاؤں میں جلنے لگے بدن
پرواز ایسے پیڑ کا سایا مذاق ہے

غزلیں

حل نہیں تھا کوئی، احباب کی رائیں تھیں بہت
اِک دِیا طاق میں تھا اور ہوائیں تھیں بہت

زندگی! کیسے مقابل ترے آ سکتا تھا
مَیں اکیلا تھا ترے ساتھ بلائیں تھیں بہت

بعض کو زہر ہی تریاق ہے، جیسے کہ ہمیں
عشق نے شانت کیا، ورنہ دوائیں تھیں بہت

واں مرے جبہ و دستار بھلا کیا کرتے
محفلِ شوق میں رنگین قبائیں تھیں بہت

دل کی بیماری ہی لاحق ہُوئی، اچھا ہی ہُوا
ورنہ تو اور بھی جاں لیوا وبائیں تھیں بہت

عقب کی ایک ہی آواز نے مبہوت کیا
یوں تو ہر سمت طرحدار صدائیں تھیں بہت

جرمِ اُلفت میں کٹا، بوجھ تو اُترا خاورؔ
دیکھا جائے تو ترے سر پہ بلائیں تھیں بہت

خاور اعجاز

کام آتی نہیں کوئی بھی تدبیر کسی وقت
پھر خود ہی بدل جاتی ہے تقدیر کسی وقت

بوجھل سا بنا دیتی ہے کمرے کی فضا کو
دیوار سے اُتری ہُوئی تصویر کسی وقت

کاغذ کا سپاہی ہُوں، قلم ہے مری شمشیر
ردّی ہی بنے گی مری جاگیر کسی وقت

مَیں نیند میں بھی جاگتا رہتا ہُوں کہ شاید
مِل جائے یہیں خواب کی تعبیر کسی وقت

صدیوں میں بھی ہو پاتا نہیں اُس کا ازالہ
ہو جائے جو انصاف میں تاخیر کسی وقت

مسماریِ بام و در و دیوار ہی خاورؔ
بن جاتی ہے اِک صورتِ تعمیر کسی وقت

غزل

خطِ آئینہ دائرہ ہے مجھے
یعنی اپنا ہی سامنا ہے مجھے

ہے سفر بھی مِری طبیعت سا
رُک بھی جاؤں تو روکتا ہے مجھے

ریت کی سلوٹوں میں ڈھونڈتا ہوں
ایک دریا کہ آئینہ ہے مجھے

چاند پر چلمنیں ستاروں کی
کوئی کھڑکی سے جھانکتا ہے مجھے

بھولتا جا رہا ہوں میں خود کو
کوئی تو یاد کر رہا ہے مجھے

تیری دنیا سے کوئی بَیر نہیں
اپنے ہونے سے مسئلہ ہے مجھے

کام انجام دے کے یاد آیا
کام تو کوئی دُوسرا تھا مجھے

آخر اُس نے پلٹ کے پوچھ لیا:
تُو یہ کس کو پکارتا ہے؟ مجھے!

مجھ کو کچھ بھی پتہ نہیں، حامدؔ
بس اِسی بات کا پتہ ہے مجھے

حامد یزدانی

غزل [نذر احمد فراز]

کسی مطرب نہ مسیحا نہ اداکار کے ساتھ
شام دیتی ہے مزہ یارِ طرح دار کے ساتھ

شوق سے سر پہ پہن اس کو مگر یاد رہے
لوگ لٹکا بھی دیا کرتے ہیں دستار کے ساتھ

مجھ کو حیرت سے نہ دیکھو کہ میں تصویر نہیں
غم لگا دیتا ہے انسان کو دیوار کے ساتھ

جان بھی اس میں چلی جائے تو افسوس نہیں
کوئی سمجھوتا نہ ہوگا کبھی معیار کے ساتھ

یوں مرے گرد اٹھائی ہیں فصیلیں اس نے
دائرہ کھینچا ہو جیسے کسی پرکار کے ساتھ

کم ہی دیکھا ہے انہیں میں نے دوبارہ بستے
آشیانے جو اجڑ جاتے ہیں اشجار کے ساتھ

لازماً کوئی کمی ہوتی ہے ان کے خوں میں
چھوڑ کر اپنے جو جا ملتے ہیں اغیار کے ساتھ

بعض اوقات تو کر جاتی ہے دنیا وہ ہاتھ
جو طوائف بھی نہیں کرتی خریدار کے ساتھ

مبتلا ہوں اسی خوش فہمی میں اب تک راحت
تھی رضامندی بھی شامل ترے انکار کے ساتھ

راحت سرحدی

غزل

میں سوچتا ہوں مگر خواب تک نہیں جاتا
ابھی میں قریۂ مہتاب تک نہیں جاتا

میں جانتا ہوں مرا ہم مزاج ہے دریا
کسی بھی حال میں سیلاب تک نہیں جاتا

وگرنہ وہ تو مجھے چھوڑ کر چلے جاتے
مرا جنوں مرے احباب تک نہیں جاتا

سفید پوشی میں اپنا بھرم رکھے ہوئے ہوں
کبھی میں ریشم و کمخواب تک نہیں جاتا

سُخن وری بھی تو اقبال رایگاں ٹھہری
یہ راستہ بھی تو اسباب تک نہیں جاتا

اقبال سروبہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

فصل تو نے بوئی تھی، لیکن اسے کاٹیں گے ہم
دیکھ تو حدِّ نظر تک لہلہاتی دوریاں

غزل

چھپ چھپ کے جہاں کرتے تھے دو سائے محبت
کھلتے ہیں وہاں آج بھی گلہائے محبت

سنتی ہے کسی کی بھی کہاں ہونے سے پہلے
کس طرح بھلا لیتی مری رائے محبت

روکا تھا بہت پھر بھی کناروں سے نکل کر
بہتا ہی چلا جاتا ہے دریائے محبت

مصروف دعاؤں میں ہیں پیڑ اور پرندے
انسانوں کو کرنی کبھی آ جائے محبت

اس واسطے جنت سے نکالا گیا مجھ کو
شامل ہیں مری ذات میں اجزائے محبت

ہم عالمِ بالا میں تجھے سوچ رہے ہیں
جاتی ہی نہیں دل سے تمنائے محبت

ماں باپ کی تو خیر یہ گھٹی میں پڑی ہے
اولاد بھی ماں باپ سے فرمائے محبت

اس دھند کے موسم میں کبھی دھوپ کی صورت
آنگن میں اچانک ہی اتر آئے محبت

دن رات کھڑی ملتی ہے دربان کی صورت
دل دشت کے دروازے پہ لیلائے محبت

مسعود احمد

غزل

ایسا نہیں کہ اس کی محبت نہیں ملی
جی کا ملال ، روح کی راحت نہیں ملی

صد شکر غم نے رکھ لی مری زندگی کی لاج
خوش ہو کے جی لوں ایسی سہولت نہیں ملی

میری بھی آرزو تھی کہ دل کھول کے ہنسوں
لیکن ترے غموں سے اجازت نہیں ملی

رخسارِ یار پر نہیں تمثیلِ گل روا
پھولوں کو اس قدر تو صباحت نہیں ملی

برسوں کے بعد دیکھا جو سوئے دیارِ دل
کوئی وہاں پرانی عمارت نہیں ملی

ہر رات مجھ کو لوٹ کے آنا پڑا ہے گھر
آوارگی بھی حسبِ ضرورت نہیں ملی

غیروں کے اختلاف کا کوئی گلہ نہیں
مجھ کو تو اپنوں کی بھی حمایت نہیں ملی

دل میں تمام خواہشیں مل جل کے رہ سکیں
چھوٹے سے گھر کو اتنی بھی وسعت نہیں ملی

خاطر میں عشق لاتا نہیں بن بلائے کو
مت جائے وہ وہاں جسے دعوت نہیں ملی

صدیوں سے آسمان و زمیں رہ رہے ہیں ساتھ
اک دوسرے سے پھر بھی طبیعت نہیں ملی

طالب بساطِ عشق پہ اک بار ہار کر
دوبارہ کھیلنے کی رعایت نہیں ملی

طالب انصاری

غزل

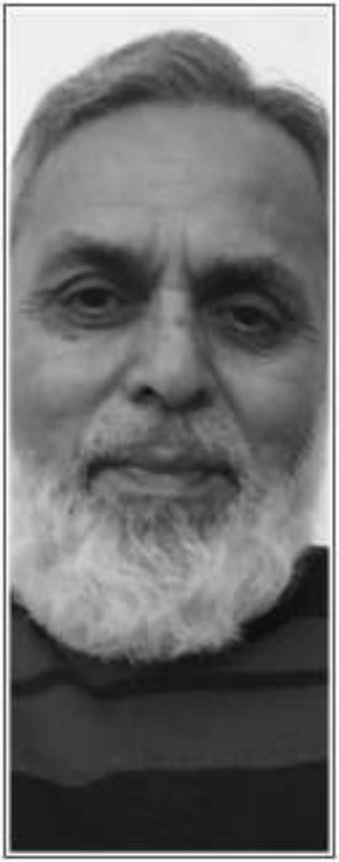

کب تلک جھوٹی اَنا باعثِ راحت ہو گی
اِک نہ اک دن تو طلوعِ صبحِ ندامت ہو گی

سچ تجھے کس طرح انصاف دلا سکتا ہے
جب ترے حق میں نہ منصف، نہ عدالت ہو گی

معتبر ہوں گے کرائے کے گواہوں کے بیاں
دم بخود عدل کے ایواں میں صداقت ہو گی

حاکمِ وقت کو حاصل ہو جہاں استثنیٰ
دورِ اسلام میں کب ایسی روایت ہو گی

رات پھر خواب میں دیکھا ہے تمھیں جانِ انیس!
آج ملنے چلے آؤ تو عنایت ہو گی

محمد انیس انصاری

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

اہلِ زنداں کے لیے تازہ ہوا آنے کو ہے
شہرِ جاناں سے کوئی تازہ نوا آنے کو ہے

غزل

تو میرے باب میں کچھ اختصار کر کے دکھا
شمار کی مجھے دُھن ہے، شمار کر کے دکھا

میں عشق ٹھیک، بہت ٹھیک کرنا چاہتا ہوں
سو میرا عشق مجھے ایک بار کر کے دکھا

نہ جانے کب تجھے تنہا یہ کام کرنا پڑے
تو میرے ساتھ مرا انتظار کر کے دکھا

بنا تو پھرتا ہے پیراک اپنے آپ میں تُو
ذرا خرابۂ دُنیا بھی پار کر کے دکھا

تُو جلتا بجھتا ہوا ہی نظر میں ٹکتا ہے
یہ روشنی ہی مجھے بار بار کر کے دکھا

پتا چلے کہ میں تیرے یہاں سے آیا ہوں
کہیں کہیں سے مجھے داغدار کر کے دکھا

یہ جھوٹ چلنا ہے اور چل پڑے گا اپنے آپ
بس ایک بار مرا اعتبار کر کے دکھا

وگرنہ مجھ کو پڑا رہنے دے پسِ پردہ
دکھانا ہے تو مجھے آر پار کر کے دکھا

ترا نتیجہ ہر اک بار مختلف کیوں ہے؟
پھر اک دفعہ ذرا میرا شمار کر کے دکھا!

میں بس گرہ کو پہنچ جاؤں، جیسے بھی پہنچوں
مرا لباس مجھے تار تار کر کے دکھا

تری نگاہ کا پہرہ کہاں کہاں نہیں تھا؟
جو کھو گئے ہیں اُنھیں واگزار کر کے دکھا

شاہین عباس

غزل

افروز رضوی

تیری میری اُڑان دیکھے گی
جب زمیں آسمان دیکھے گی

تیری موجِ تباہ کن میری
قوتِ بادبان دیکھے گی

آنکھ اُٹھا کر زمین بھی اک دن
بارشِ آسمان دیکھے گی

تیری راہِ طلب میں بن کے غبار
خاک اپنی اُڑان دیکھے گی

وحشتِ دل فراق میں تیرے
کمرۂ امتحان دیکھے گی

جب اٹھے گی گھٹا دل و جاں سے
دھوپ پھر سائبان دیکھے گی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ بھید کھلا معرفتِ شام و سحر سے
دن، شب سے جدا ہے نہ الگ عیب، ہنر سے

غزل

سورج ہمارے بخت کا ایسے بھی ڈھل گیا
اس بار گھر ہمارا چراغوں سے جل گیا

گوری نے آ کے دھوپ میں جرسی اتار دی
اور دیکھتے ہی دیکھتے موسم بدل گیا

وہ سہہ سکا نہ عشق کی ہلکی سی آنچ بھی
اک پل میں سارا روپ کا سونا پگھل گیا

یوں ہی نہیں ہے آنکھ میں خوابوں کی روشنی
میں رہگزارِ عشق میں پلکوں کے بل گیا

تیرے بنا بھی عشق سلامت ہے آج تک
یہ طفل ماں کی گود سے باہر بھی پل گیا

رکھا جو اُس نے درد کے شانوں پہ اپنا ہاتھ
گرتے ہوئے میں پھر سے اچانک سنبھل گیا

پھر ایک دن میں ہو گیا سائے سے بے نیاز
پھر ایک دن یہ عمر کا سورج ہی ڈھل گیا

حسنِ سفر کو کھا گئی منزل کی دلکشی
میں اپنا ہاتھ چھوڑ کے آگے نکل گیا

سرخی شفق کی رات کے ساغر میں گھل گئی
دستِ فلک سے شام کا سورج پھسل گیا

شاہد شبِ وصال جدائی میں کٹ گئی
خوشیاں اداس رات کا بستر نگل گیا

افتخار شاہد

غزل

ہم نے محبت جھیلی ہے
خون کی ہولی کھیلی ہے

خواہش نئی نویلی ہے
چنچل شوخ اکھیلی ہے

تارے میرے ساتھی ہیں
چاندنی رات سہیلی ہے

کوئی نہ اِس کو بُوجھ سکا
جیون ایک پہیلی ہے

اپنی محبت کی قاتل
اُونچی لال حویلی ہے

کوئی کسی کے ساتھ نہیں
سب کی ذات اکیلی ہے

خواب گرے سب آنکھوں سے
خالی ہاتھ ہتھیلی ہے

تُو جو میرے ساتھ چلے
ہر ساعت البیلی ہے

اشک پلا کر پالوں گی
اُلفت گود میں لے لی ہے

میرا جُھمکا جہاں گرا
شہر کا نام بریلی ہے

چاہت تیری یوں میٹھی
جیسے گُڑ کی بھیلی ہے

خالدہ انور

غزل

زخم دل جب کبھی یہ سلتے ہیں
کچھ نئے زخم آن ملتے ہیں

گنگنائے ، کلی چٹختی ہے
مسکرائے تو پھول کھلتے ہیں

دل مرا کیوں اُداس ہوتا ہے
شام و شب جب گلے سے ملتے ہیں

صُبح سے شام کیوں نہیں ملتی
رات اور دن تو روز ملتے ہیں

ساتھ چلتے ہوئے جو بچھڑے ہیں
ڈھونڈتا ہوں ، کہاں وہ ملتے ہیں

کتنا حساس ہو گیا اجمل
پھول پکڑے تو ہاتھ چھلتے ہیں

اجمل اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

برے دنوں کے دکھی ساعتوں کے ساتھی ہیں
یہ لوگ بھی مرے غارت گروں کے ساتھی ہیں!

غزل

مجھے وہ بھول گیا ہے تو کوئی بات نہیں
نظر سے دور ہوا ہے تو کوئی بات نہیں

کہاں ہر اک کا مقدر ہے آبلہ پائی
جو زخم زخم ہرا ہے تو کوئی بات نہیں

چراغ فکر جلائیں گے محفلِ شب میں
دیا بجھا کے گیا ہے تو کوئی بات نہیں

چلے گی ٹھنڈی ہوا بھی، یقینِ کامل ہے
چمن میں گرم ہوا ہے تو کوئی بات نہیں

یہی ہے عشق کا تریاق ہم بھی کہتے ہیں
جو اس نے زہر پیا ہے تو کوئی بات نہیں

یہ اختلاف محبت کی جان ہے پیارے
اگر وہ شکوہ سرا ہے تو کوئی بات نہیں

وہ خود ہی آئے گا اک روز لوٹ کر دانش
اگر وہ ہم سے خفا ہے تو کوئی بات نہیں

اعجاز دانش

غزلیں

کبھی زندگی کی خواہش، کبھی آرزو اجل کی
کبھی راس دشتِ ویراں، کبھی جستجو محل کی

مرے سامنے سے گزرا، نہ کیا سلام جس نے
مرے ہاتھ چومتا تھا، ابھی بات ہے یہ کل کی

وہی کامیاب ٹھہرا ہے جہانِ تاز و تگ میں
جو کرے صمیمِ دل سے، سدا پیروی عمل کی

یہ عجیب سانحہ ہے، وہ مجھے بھلا چکا ہے
کبھی رکھتا تھا خبر تک، جو مرے ہر ایک پل کی

نہ ثبات ہے کسی کو، نہ دوام ہے کسی کو
وہ ہو خار کی کہانی، کہ ہو داستاں کنول کی

کسی سوختہ جگر نے، مجھے عشق سے تھا روکا
کوئی قیس تھا عرب کا، کہ سسی تھی کوئی تھل کی

میں بیانِ حسن جاناں، کروں اس طرح سے شوکت
کبھی ذکر نظم کا ہو، کبھی بات ہو غزل کی

شوکت محمود شوکت

وہاں وہاں پہ بہاروں کے قافلے، دیکھے
جہاں جہاں پہ پرندوں کے چہچہے، دیکھے

رہیں جو رات، اندھیروں سے برسرِ پیکار
ہوا کی زد میں ہمیشہ وہی دیے دیکھے

سکون، حسن کی قسمت میں ہو تو ہو، لیکن
نصیبِ عشق میں برسوں کے رت جگے، دیکھے

وہ جن کا ذکر، کتابوں میں اب نہیں ملتا
نگاہ پیرِ فلک نے وہ حادثے دیکھے

بہارِ زیست سے ہرگز نہ حظ اٹھا پائے
کہ کور چشموں کے دل میں بجھے بجھے دیکھے

شعورِ ذات، میسر جنھیں ہوا، سو ہوا
شعورِ ذات سے ہٹ کر بھی فلسفے دیکھے

مثالِ خانہ بدوشاں بھٹکتے پھرتے رہے
میانِ منزل و شوکت، وہ فاصلے دیکھے

غزلیں

مشکل روڑہ بن جاتا ہے
ملن بچھوڑہ بن جاتا ہے
آنسو ، آنسو مل کے سمندر
یونہی تھوڑا بن جاتا ہے
اتنا تیز دھڑکتا یہ دل
پاگل گھوڑا بن جاتا ہے
چار اطراف ، نکیلے پتھر
حرف ، ہتھوڑا بن جاتا ہے
انجانے دو انسانوں کا
فلک پہ جوڑا بن جاتا ہے

کینسر بعد میں ، دکھ کا پہلے
بدن میں پھوڑا بن جاتا ہے
موم کے اک پتلے سا انساں
جدھر کو موڑا، بن جاتا ہے
رخشندہ ! محبوب تمھارا
ایک بھگوڑا بن جاتا ہے

رخشندہ نوید

درد و غم زیادہ ہیں، نسبتاً خوشی کم ہے
زندگی کے حصے میں ایک زندگی کم ہے

بار، بار اس دل کا دار پر چڑھے رہنا
جان دینے والوں کی، کیا یہ خودکشی کم ہے؟

اک تضاد دیکھا ہے عمر بھر یہی ہم نے
خوش مزاج کہلائے، ہونٹ پر ہنسی کم ہے

چند ایک سے ہٹ کر چار سو زمانے کی
بیچ دار گلیوں میں، حسن و روشنی کم ہے

مل تو جائے ، رخشندہ ! پکی نوکری لیکن
جان من ترے اندر خوئے بندگی کم ہے

غزل

زین گھوڑوں پہ ہے اور زر ہیں اتاری نہیں ہیں
ہاتھ تلوار پہ ہیں ہمتیں ہاری نہیں ہیں

ہم کہ حالات کے چکر میں ہیں آئے ہوئے لوگ
پیشہ ور مانگنے والے تو بھکاری نہیں ہیں

ہم پہ یوں مرضی مسلط نہیں کی جا سکتی
ہم ترے کھیت مزارع نہیں، ہاری نہیں ہیں

آگے جنگل ہے جہاں شیر ہیں چیتے ہیں میاں
لوٹ جائیں وہ یہیں سے جو شکاری نہیں ہیں

حکم ربی ہے تو کر دیتے ہیں رخصت ورنہ
کون سی بیٹیاں کس باپ کو پیاری نہیں ہیں

تیری ہر بات پہ لبیک کہیں اور ہر حکم
ہم بجا لائیں رعایا تو تمہاری نہیں ہیں

نفع نقصان کی تفریق سے ہم واقف ہیں
خود سے بیگانہ نہیں عقل سے عاری نہیں ہیں

اکرم ناصر

غزل

گر ہے ہمت ظلم کے بازار پر اُنگلی اُٹھا
جو ڈبوئے خوں میں اُس دستار پر اُنگلی اُٹھا

شب کے رُخ پر روشنی کے ہاتھ سے تحریر لکھ
حوصلہ کرکے ذرا دو چار پر اُنگلی اُٹھا

پہلے اپنی گفتگو سے لفظ پتھریلے نکال
پھر کسی کے لہجہ و گفتار پر اُنگلی اُٹھا

راکھ کر دیتی ہیں یہ بارود کی بیساکھیاں
اِن کے شعلوں میں چھپے اَسرار پر اُنگلی اُٹھا

ذہن میں رکھ لے یزیدِ ظُلم کے انجام کو
پھر غلامِ حیدرؓ کرار پر اُنگلی اُٹھا

کیوں جلانا چاہتا ہے جسم و جاں کو تو عقیل
سوچ کر ہی پھول سے رُخسار پر اُنگلی اُٹھا

عقیل رحمانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پلٹ نہ جائیں ترے ہجر کے جہنم سے
یہ راستے کہ مری ہجرتوں کے ساتھی ہیں

غزل

رہتا ہے قربتوں کا وہ احساس ہر گھڑی
وہ دور جا کے بھی ہے مرے پاس ہر گھڑی

تنہا کٹیں گے کیسے یہ جیون کے راستے
ڈستا ہے یہ جدائی کا احساس ہر گھڑی

رہتی ہے اس کی خوشبو سے ہر لحظہ گفتگو
بکھری ہے اس کی چاروں طرف باس ہر گھڑی

مجھ سے خفا خفا ہیں یہ محفل کی رونقیں
پیچھے پڑا ہے میرے یہ بن باس ہر گھڑی

مایوسیوں کے گھور اندھیروں کے باوجود
جگنو سی ٹمٹماتی ہے اک آس ہر گھڑی

ہر لحظہ خیمہ زن ہے یہاں کربلا سی دھوپ
لپٹی ہوئی ہے مجھ سے وہی پیاس ہر گھڑی

اخلاص کی تلاش میں بھٹکا ہوں عمر بھر
مجھ پہ ہے طعنہ زن مرا اخلاص ہر گھڑی

اس کے بغیر لگتی ہے بے کیف زندگی
جب وہ ملے تو ہوتی ہے پھر خاص ہر گھڑی

جھڑتے ہیں پھول منہ سے وہ جب گفتگو کرے
بکھراتا ہے وہ گوہر و الماس ہر گھڑی

ہر لحظہ بے قرار ہی رہتا ہے میرا دل
جیسے ہو ناخنوں سے جدا ماس ہر گھڑی

کیسے نزولِ مصرعِ تر ہو کوئی جلیل
گھیرے ہوئے ہے سوچ کا افلاس ہر گھڑی

احمد جلیل

غزل

تصویر تری دل سے اتر کیوں نہیں جاتی
حسرت ترے دیدار کی مر کیوں نہیں جاتی

اس درجہ میں بیزار ہوں اس دل کے جنوں سے
حالت بھلا اس دل کی سدھر کیوں نہیں جاتی

سب اہلِ چمن پر تو کرم عام ہیں تیرے
اک چاہنے والے پہ نظر کیوں نہیں جاتی

پت جھڑ کی یہ رت آن ہی ٹھہری ہے بھلا کیوں
دائم نہیں رہنا تو گذر کیوں نہیں جاتی

یہ پوچھتا پھرتا ہے پریشان مسافر
یہ راہ محبت کے نگر کیوں نہیں جاتی

اتنی بڑی دنیا میں یہ دل آیا ہے تم پر
مجھ پر ہی نگہ تیری ٹھہر کیوں نہیں جاتی

رکھتا ہے نظر سارے جہاں پر تو بھلا پھر
مجھ مظہرِ خستہ پہ نظر کیوں نہیں جاتی

ضیاء المظہری

غزل

یہ تو بس وقت گزاری ہے محبت کیسی
خواب میں خواب دکھانے کی ضرورت کیسی

تم کو معلوم ہے کس سمت ہوا کا رخ ہے
پڑ گئی خاک اُڑانے کی ضرورت کیسی

رات دن ایک کیے میں نے اسی مقصد میں
اب مجھے دیکھ کے ہے آپ کو حیرت کیسی

عشق ورثے میں کہاں ملتا ہے معلوم ہے یہ
آپ کا حق ہے ..... محبت میں اجازت کیسی

مدتوں بعد سنورتے ہوئے دیکھا ..... تو کہا
اف ..... روایت سے نکل آتی ہے جدت کیسی

شعر کا وزن تو قائم ہے فقط مجھ سے ہی
میرے ہوتے ہوئے مصرعے میں اضافت کیسی

اِک تماشا سرِ بازار لگا رہتا ہے
اتنا معیار گرانے کی ضرورت کیسی

میں ہُوں خاموش تو بزدل وہ سمجھنے لگا ہے
دیکھئے ہو گئی اس شخص کی جرأت کیسی

جھوٹ سننے کے وہ عادی ہیں ثمینہ سید
میں نے اب سچ جو کہا ہے تو شکایت کیسی

ثمینہ سیّد

غزل

انصر حسن

تری جبین سا روشن کوئی چراغ ملے
تو پھر کہیں سے ہمارا ہمیں سراغ ملے

ہمیں یہ دشت کی ریگِ رواں ملی ہے میاں
وہ اور لوگ ہیں جن کو کسی سے باغ ملے

ترا دماغ تو ہوتا ہے عرش پر اکثر
ترے دماغ سے کیسے مرا دماغ ملے

جسے لبوں سے لگاؤں تو زندہ ہو جاؤں
تمہارے ہاتھ سے ایسا مجھے ایاغ ملے

میں چاہتا ہوں کہ اپنا بھی کچھ خیال کروں
ترے خیال سے مجھ کو اگر فراغ ملے

مرا سلام بھی کہنا اُسے نگر والو
اگر کہیں وہ زمانے کا بددماغ ملے

یہ بات میرے مقدر کی بات ہے انصر
دیے تھے میں نے کبوتر پہ مجھ کو زاغ ملے

غزل

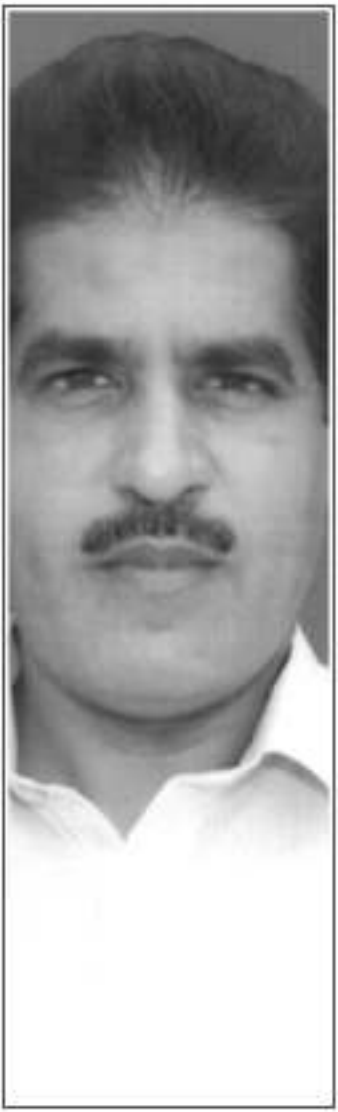

کس نے آزادی کا مضموں لکھ دیا دیوار پر
خون کے چھینٹے نظر آنے لگے دستار پر

آ ہی جاتی ہیں لبوں پر دل میں پنہاں تلخیاں
جتنی بھی پابندیاں عائد رہیں اظہار پر

زندگی میں اور بھی ہیں کام، اے جانِ غزل!
یہ نظر رہتی نہیں پیہم لب و رخسار پر

سچ کہا تو داد دینے کے لیے کوئی نہ تھا
جھوٹ جب بولا تو شہ سرخی بنا اخبار پر

عشق کو تو ہر طرح ہے بے کلی کا سامنا
وصل کے اقرار سے وہ آ گیا انکار پر

پھینکتے ہو کس لیے اب تم فضاؤں میں مجھے؟
کر دیئے جب کاٹ کر تم نے مرے بیکار پر

کاٹ کر رکھ دیں نہ عالم سے ہمیں یہ ایک دن
سو چکے ہیں ہم بھروسہ کر کے جن اغیار پر

حاصل کیا بے خبر سے کر کے شکوہ درد کا ؟
بات بڑھ جائے گی فرحاں اس قدر تکرار پر

سرور فرحان

غزلیں

اب حسیں سامنے سے گزرتا نہیں
پھر بھی دل کیوں سنبھالے سنبھلتا نہیں

خوف چھایا ہے ایسا مرے شہر میں
اب گھروں سے کوئی بھی نکلتا نہیں

ساتھ چھوٹا ہے جب اس حسیں شخص کا
خواب آتے نہیں دل بہلتا نہیں

میں نے بچپن سے ہے جو سنبھالا ہوا
کھوٹا سکہ کہیں اب وہ چلتا نہیں

سہمے سہمے سبھی لوگ ہیں شہر کے
اب خوشی سے کوئی بھی اچھلتا نہیں

یہ بڑھاپے کی ہے اک علامت کہ اب
دل حسیں دیکھ کر بھی مچلتا نہیں

عابد معروف مغل

مقتل سے دیکھنا وہی نکلیں گے شان سے
مضبوط جن کے ہوں گے ارادے چٹان سے

تجھ کو پتا چلے جو تماشے لگے یہاں
نیچے اُتر کے دیکھ کبھی آسمان سے

آ دیکھ عمر بھر کے اثاثے یہی تو ہیں
انبار تیری یادوں کے نکلے مکان سے

یہ جانتے ہیں سارے منافق نہیں ہوں میں
جو پوچھنا ہے پوچھ اسی خاندان سے

دہشت کی ان فضاؤں سے اکتا کے ایک دن
ڈھونڈو گے تم سکون یہاں ہر دکان سے

مدت کے بعد کل یہاں جو فیصلہ ہوا
قاتل پکڑ میں آ گیا خوں کے نشان سے

عابد جو میرے دشمنوں کی صف میں ہیں کھڑے
کیوں پوچھتے ہیں راز مرے راز دان سے

غزل

جس جگہ آب نہیں ہوتا شجر ہوتے نہیں
سوکھے دریا کے کناروں پہ نگر ہوتے نہیں

کیسے نکلوں گا میں ان حبس بھری گلیوں سے
شہرِ ہجراں کی فصیلوں میں تو در ہوتے نہیں

تیرے جانے پہ حقیقت یہ کھلی ہے مجھ پر
اپنے دِکھتے ہیں یہاں لوگ، مگر ہوتے نہیں

یہ نہیں ہے کہ اکیلا ہی نکل جاتا ہوں
شام کے وقت مرے دوست بھی گھر ہوتے نہیں

زندگی کو جو سہاروں کے بِنا جیتے ہیں
ان کی آنکھوں میں کبھی موت کے ڈر ہوتے نہیں

اپنی دستار گرا کر جو بچا لیتے ہیں جان
اُن کے کاندھوں پہ کبھی دیکھنا سر ہوتے نہیں

عمران اعوان

غزلیں

نہ آدمی پہ خدا کی زمین تنگ کرو
اگر ہو جنگ ضروری، ضرور جنگ کرو

جمی ہوئی ہے سیاہی طویل مُدّت سے
کبھی تو دِل کے مکاں پر سفید رنگ کرو

حیات جس نے گزاری ہے بندگی میں سدا
نہ ہمکنار اُسے دستِ تیغ و سنگ کرو

ہے جس پہ عُمر بتانی، چُنو وہی بستر
جو نیند بخشے، وہی منتخب پلنگ کرو

عقیدتوں کی بلندی پہ لوگ رشک کریں
دھمال ناز کرے، خود کو یوں ملنگ کرو

جو لوگ بابِ تحیّر کی سمت جا نہ سکے
اُنھیں بھی سونپ دو حیرت، اُنھیں بھی دنگ کرو

منافقت کے لبادے کا اُس پہ ہو نہ گماں
سو آفتاب کرو بات جو، دبنگ کرو

آفتاب خان

نِکل سکا نہ اس لیے بھی سیپ سے صَدف ابھی
کہ سب ہی لوگ پالتے ہیں دوسرے شغف ابھی

کِسی کو آبِ زندگی سے کب رہی ہے کچھ غرض
سمیٹنے لگے ہیں سب، سمندروں سے کف ابھی

یہ عہد نامۂ وفا قبولیت نہ پا سکا
کہ تُو نے اس پہ دستخط کیے ہوئے ہیں رف ابھی

پیامِ آخری سُنا کے جا چکا پیامِ بر
مگر سنائی دے رہا ہے دُور ہی سے دَف ابھی

سُنا ہے پھر نیا اِمام اب پڑھائے گا نماز
عقیدتوں سے مُقتدی کھڑے ہیں صف بہ صف ابھی

جنھیں جہان بھر کی مُشکلات آ دبوچ لیں
انھیں کے واسطے ہے عافیت، یہ گوشۂ نجف ابھی

ردائے نیند سے نہ ڈھانپ چشمِ خواب ناک تُو
دُرست ہی نہیں، مکانِ عشق پَر ہدف ابھی

جو اہلِ ظرف تھے یہاں، وہ پا گئے ہیں مرتبے
کسی بھی بدمعاش، کو مِلا نہیں شرف ابھی

گُلوں کی خوشبوئیں سمیٹ، سہ پہر کی دھوپ میں
پَکٹ سکی نہ چھاؤں، آفتاب کی طرف ابھی

غزل

جس جس طرح سوا ہوتا ہے برسات کے بعد
تشنگی اور بڑھی ایک ملاقات کے بعد

کس کو لگتا ہے بھلا صبح کا سورج اچھا
تیرے جوبن کے الاؤ میں گُندھی رات کے بعد

اُس میں خوشبو بھی حرارت بھی کہیں مجھ سی نہو
تو نے جس ہاتھ کو تھاما ہے مرے ہات کے بعد

تو نے رکھی ہے تعلق کے مقابل دنیا
دوستا مجھ کو اجازت تری اس بات کے بعد

ان ہوس زادوں کو اتنا نہیں معلوم کہ عشق
جسم کو اپنا بناتا ہے مگر ذات کے بعد

تجھ سے مل پاتے کبھی عرصۂ دنیا سے اُدھر
کم سے کم اتنا تو بچتا گزر اوقات کے بعد

کتنے اشکوں سے دُھلی آنکھ تو جاذبؔ دیکھا
چہرۂ صبحِ وطن تاروں کی بارات کے بعد

شکیل جاذب

غزل

اوّلیں اور آخری تنہا
صاحبو! ایک ہے "علی" تنہا

رنگ سب اُڑ گئے ہَواؤں میں
پھر تری یاد رہ گئی تنہا

تیرگی میں بھی ہے شعاعِ اُمید
اِتنے غم اور اِک خوشی تنہا

اُن مکانوں میں پھول کِھلتے ہیں
دیکھتا ہے اُنہیں کوئی تنہا

اُس سے بچھڑا تو پھر سمجھ آئی
کیسے ہوتا ہے آدمی تنہا

لوگ سب اپنے کام کاج میں گُم
ہوتی جاتی ہے زندگی تنہا

سب کو تنہائی سے بچانے لگا
اور پھر ہو گیا وہی تنہا

میرے چاروں طرف اندھیرا ہے
بس یہاں پر ہے روشنی تنہا

میرا محسن بھی ہے ظہور وہی
اور مرا دوست بھی "علی تنہا"

ظہور چوہان

غزل

تنہا کھڑے تھے جرأتِ اِنکار ہم ہی تھے
ظلمت کی شب سے برسرِ پیکار ہم ہی تھے

گو اِبتدا میں نام گوارا نہ تھا انہیں
پھر یوں ہوا کہ محورِ گفتار ہم ہی تھے

جیسے کوئی چراغ ہواؤں کی زد پہ ہو
ایسے دیے کے ساتھ ہر اک بار ہم ہی تھے

اِس پار بھی گھڑے کی کہانی وفا کی تھی
اُس پار بھی وفاؤں کا معیار ہم ہی تھے

جرمِ وفا کے واسطے مشقِ ستم ہوئی
جرمِ وفا کے آخری اوتار ہم ہی تھے

ہم پر تھے حق نوائی کے الزام جا بہ جا
آخر یہی ہُوا کہ سرِدار ہم ہی تھے

طلعت شبیر

غزل

اب نہیں مجھ میں چاہتیں باقی
رہ گئیں تیری عادتیں باقی

بٹ گیا دل تو کرچیوں میں، پر
ہیں سبھی میں شباہتیں باقی

دیکھ بے نور ہو گئیں آنکھیں
ہیں مگر اِن میں حسرتیں باقی

پھول کلیوں میں اِس چمن کے اب
رنگتیں ہیں نہ نکہتیں باقی

میرے خوابوں میں اور کچھ بھی نہیں
یار کی ہیں شباہتیں باقی

کر چکا ہوں وضاحتیں ساری
پھر بھی ہیں کچھ وضاحتیں باقی

لذتِ عشق کھو گئی لیکن
رہ گئی ہیں اذیتیں باقی

ایک مدّت سے چل رہا ہوں ندیمؔ
"اور ہیں کتنی منزلیں باقی"

ریاض ندیم نیازی

غزل

ایک بے چینی مرے دِل کو لگی رہتی ہے
ایسا لگتا ہے کہیں کوئی کمی رہتی ہے

وقت بھی راکھ ہوا ، خاک ہوئی اس کی لگن
کوئی چنگاری مگر دِل میں دبی رہتی ہے

تیرے آ جانے کی ساعت نہ کہیں کھو بیٹھوں
سوتے سوتے بھی مری آنکھ کھُلی رہتی ہے

آئنہ خانے میں اب مَیں نہیں تُو بستا ہے
تیرے ہونے سے مرے گھر میں خوشی رہتی ہے

راستے اب بھی ترے واسطے بچھ رہتے ہیں
اور منڈیروں پہ تری یاد جلی رہتی ہے

آتا ہے جب بھی تری یاد میں لِپٹا جھونکا
دیر تک کمرے میں اِک خوشبو رُکی رہتی ہے

شبہ طراز

غزل

عاصم اعجاز

فضا میں دائرہ سا بن رہا ہے
نیا اک راستہ سا بن رہا ہے

لڑائی اب بڑائی کی نہیں ہے
بڑا پن مسئلہ سا بن رہا ہے

سکوت مستقل ہونے لگی تھی
سفر کا سلسلہ سا بن رہا ہے

الجھ پڑتا ہوں تیرے خال وخد سے
جنوں بھی مشغلہ سا بن رہا ہے

محبت اور نفرت ساتھ رکھ کر
انوکھا ذائقہ سا بن رہا ہے

سنگ و ثمر چھاؤں کے مانند برستے ہی رہیں گے
یوں تو شانوں پہ ہیں لیکن تہِ دستار نہیں ہیں

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

غزل

اس کی باتیں سنا رہی ہے ہوا
مجھ کو پاگل بنا رہی ہے ہوا

بنتے جاتے ہیں نقش پانی پر
اپنا جادو دکھا رہی ہے ہوا

وا کیے بیٹھا ہوں دریچۂ دل
اس کی یادوں کی آ رہی ہے ہوا

بات سنتا نہیں کوئی اس کی
کب سے در کھٹکھٹا رہی ہے ہوا

شور جنگل کا سن کے لگتا ہے
مجھ کو شاید بلا رہی ہے ہوا

دے رہی ہے تسلی جھوٹی مجھے
آنسوؤں کو سکھا رہی ہے ہوا

دیر سے بے قرار لگتی ہے
خشک پتے اڑا رہی ہے ہوا

کس طرح روکوں میں اسے شوکت
نام اس کا مٹا رہی ہے ہوا

افتخار شوکت

غزلیں

ہوتا ہے کام یُوں بھی وفا کے نصاب پر
آنکھیں کسی کی راہ میں، اُنگلی کتاب پر

یہ بھی تو ایک رنگ ہے عہدِ شباب کا
کرتی ہیں رقص خواہشیں دل کے رباب پر

فیشن میں ڈھل گئی ہے نمائش وجود کی
اُٹھنے لگی ہیں اُنگلیاں سادہ نقاب پر

مانا وہ بے وفا ہے مگر اِس کے باوجود
کرتے ہیں لوگ رشک مرے انتخاب پر

اکرم سحر فارانی

عشق جب آہ بھرے سوختہ سامانی میں
آگ لگ جاتی ہے رسموں کے رواں پانی میں

جوش میں ہوش کا میں اس لئے رکھتا ہوں خیال
عقل بہہ جائے نہ جذبات کی طغیانی میں

کتنا مشکل ہے جدائی کی اذیت سہنا
خودکشی کرنے لگے خواب پریشانی میں

کون آتا ہے حفاظت کی ضمانت دینے
جب کوئی گھر ہو لٹیروں کی نگہبانی میں

سینچے گا کس طرح وہ محبت کا گلستاں
جس نے وفا کا ڈیم بنایا سراب پر

ایسے میں خامشی ہی مناسب جواب ہے
جب سینکڑوں سوال اُٹھیں اِک جواب پر

میری طویل عمر تو اِتنی سی ہے سحرؔ
ٹھہرا ہوا حباب ہوں میں سطحِ آب پر

میری آنکھوں میں ترا عکس نظر آتے ہی
آئنہ چوم لیا عشق نے حیرانی میں

اب ہیں جنگل کے مناظر مرے گلشن میں سحرؔ
بھیڑیئے پھرنے لگے خلعتِ انسانی میں

غزل

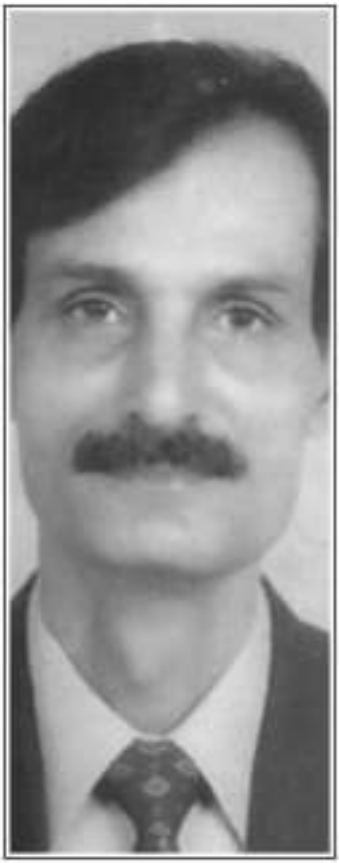

دیکھو اس شخص سے اتنی نہ محبت کرنا
بھول جائے نہ کہیں ہم سے وہ نفرت کرنا

دوستی خوب نبھائی ہمیں تسلیم مگر
دشمنی میں بھی نہ اب جان رعایت کرنا

مصلحت پیش ہے ورنہ ہمیں سب ہے معلوم
سر اٹھائے ہوئے دنیا سے بغاوت کرنا

عہد کم ظرف کی باتوں کا برا مت جانو
اس کی فطرت میں نہیں کوئی عنایت کرنا

یہ برا وقت سہی یہ بھی گزر جائے گا
ظلم کے آگے کبھی جھکنا نہ منت کرنا

مظہر امام

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بت کو دیکھا تو بت ہوا خالد
جی میں تھا ، دیکھ کر گزر جاؤں

غزل

دل فسردہ بہ چشمِ تر آئے
چھوڑ کر ہم بھی اپنا گھر آئے

ایسا لگتا تھا کر رہے ہوں وداع
راہ میں جو گھنے شجر آئے

یاد کرتے ہوئے اُسے آخر
اُس کے کوچے سے ہم گزر آئے

جس کو دیکھو وجود میں اپنے
تنہا تنہا یہاں نظر آئے

شیشۂ اعتبار کیا ٹوٹا
دل کی مسند سے ہم اُتر آئے

جب سے آئیں نئی نئی چیزیں
تھے پرانے جو گھر نکھر آئے

آسماں اشکبار ہوتا ہے
دل کی آہوں میں جب اثر آئے

ہو گئے دُور ایک لمحے میں
ساتھ جو عمر بھر نظر آئے

زندگی میں جنھیں بُھلا نہ سکے
زیست میں ایسے بھی سفر آئے

تیری محفل میں دوسروں کی طرح
چاہتے تو نہ تھے مگر آئے

کہہ اٹھے لوگ دیکھ کر مجھ کو
شکر ہے آج تم نظر آئے

ملنا چاہے گا ہر کوئی آکر
تیری محفل میں ہم اگر آئے

خود کو لوگوں سے منسلک رکھنا
ہاتھ مشکل سے یہ ہنر آئے

خون میثم کا دے رہا ہے صدا
ہم سرِ دار لے کے سر آئے

خود کو ہم ڈھونڈتے رہے طاہر
کرکے ہجرت نگر نگر آئے

طاہر ناصر علی

غزلیں

کوئی تمثیل نہیں ہے یہاں پیارے میری
نقل کرتے ہیں فلک پر یہ ستارے میری

میں نے اک پیڑ لگایا کہ یہاں چھاؤں رہے
جان لینے پہ تلے ہیں یہاں سارے میری

مچھلیاں دیکھ کے چپ چاپ پلٹ جاتی ہیں
کوئی اوقات نہیں جھیل کنارے میری

اس سے کہنا کہ جہاں کوئی نہ ہو میں بھی نہ ہوں
اس سے کہنا وہاں تصویر اتارے میری

دوستو تم ہی بتاؤ مجھے کیسا ہوں میں
کوئی رائے نہیں بنتی مرے بارے میری

رمزی آثم

کسی چراغ کسی روشنی کو مت دیکھو
ہمارے ساتھ رہو اور کسی کو مت دیکھو

تم اپنے آپ کو دیکھو کہاں پہ بہتر ہو
ہمارے غم کو، ہماری خوشی کو مت دیکھو

ہمارے ساتھ بڑا مسئلہ ہے محفل میں
اُسی کے واسطے جاؤ اُسی کو مت دیکھو

ہمارے درد کو سمجھو اگر سمجھتے ہو
لبوں پہ آئی ہماری ہنسی کو مت دیکھو

تمھیں جو دیکھتا رہتا ہو رات دن آثم
نظر اٹھا کے اسی آدمی کو مت دیکھو

غزل

ہوائے سرد چلی ساتھ ہو لیا میں بھی
مثالِ برگِ خزاں دیر تک اُڑا میں بھی

کسی طرح سے تو ٹوٹے یہ تیرگی کا فسوں
چراغ شب کو جلاتے ہوئے جلا میں بھی

جدھر نگاہ پڑی ایک ہُو کا عالم تھا
نجانے کونسے سگنل پہ رک گیا میں بھی

سمے کی دھوپ نے جھلسا دیا مجھے ورنہ
دکھائی دیتا تھا تھم سا ہرا بھرا میں بھی

بتا رہے ہو مجھے کون سی قیامت کا
ہزار بار تو کرتا ہوں سامنا میں بھی

گنوا کے زیست کی پونجی مجھے خیال آیا
کہ اپنے بارے میں اے کاش سوچتا میں بھی

کسی شمار میں آیا نہیں مگر ارشد
تمھارے چاہنے والوں میں تھا کھڑا میں بھی

ارشد محمود ارشد

غزل

تم پہ لازم ہے کہ ہر چال کو الٹا کھیلو
سامنے والا تو چاہے گا کہ آدھا کھیلو

وصل کی شرط پہ شطرنج وہ ہاری تو کہا
میں نہیں کھیلتی تم مجھ سے دوبارہ کھیلو

کپکپاتی ہوئی پوروں کو سنبھالو اپنی
موت کے کھیل کو اچھے سے مسیحا کھیلو

اس لیے آج تلک جیت سے واقف نہیں میں
حکم صادر تھا کہ ہر کھیل ہی تنہا کھیلو

فائدہ کیا حدِ فاصل سے تجاوز کر کے
جتنا آتا ہے تمہیں کھیلنا اتنا کھیلو

آخری سانس تلک ہجر نبھاؤ یارو
جاں ہتھیلی پہ دھرو اور اسے پورا کھیلو

تُو تو شاطر ہے ترے ساتھ نہ کھیلوں گی کبھی
کھیلنا ہے تو مرے ساتھ بھی مجھ سا کھیلو

دس تلک گنتا ہوں میں گنتی کہیں چھپ جاؤ
پھر سے تم آنکھ مچولی مرے یارا کھیلو

عشق میں بچے ادھڑتے ہوئے دیکھے دانش
اس لیے مشورہ دیتا ہوں کہ تم نا کھیلو

دانش عزیز

غزل

دُھندلے دُھندلے سے ہیں کیوں شمس و قمر کون کہے
کس نے پامال کیا حُسنِ سحر کون کہے

کون سمجھے گا یہاں دل کے دھڑکنے کی صدا
اُن سے احوالِ جگر، دیدۂ تر کون کہے

کون ایسا ہے جو دریا کی تہوں میں اُترے
سیپ سے کس نے نکالے ہیں گہر کون کہے

کس نے رکھے ہیں در و بام، دریچے اُلٹے
کس نے عجلت میں بنایا ہے یہ گھر کون کہے

دیکھ سکتا ہے یہاں کون کسی کی جانب
کون اس شہر میں ہے اہلِ نظر کون کہے

کس نے جھیلا ہے رہِ شوق کی بے تابی کو
تلخ ہے منزلِ ہستی کا سفر کون کہے

کون رہتا ہے پشیمان مرے سینے میں
کون چلّاتا ہے یہ شام و سحر کون کہے

کون بتلائے ضمیروں کی کسک کیسی ہوئی
کیسے دستار سے خالی ہوئے سر کون کہے

بھاگتے بھاگتے اِک عمر ہوئی رستوں پر
اور ہے کتنا بھلا رنجِ سفر کون کہے

ہاتھ خالی ہیں ہر اک شخص کا دامن خالی
کس نے پایا یہاں محنت کا ثمر کون کہے

کس لیے لوگ ہیں اِس شہر میں سہمے سہمے
ہر طرف پھیلا ہے کیا خوف و خطر کون کہے

کس نے ندّی کو بہایا ہے کنویں کی جانب
دُھوپ میں کس نے جلائے ہیں شجر کون کہے

گرد آلود ہُوا شہرِ سخن کس کے سبب
کیا ہُوئے صاحبِ فن، اہلِ نظر کون کہے

کون اِس عہدِ ستم گار میں لب کھولے نبیل
زندگی کیسے کریں لوگ بسر کون کہے

نبیل احمد نبیل

غزل

نقشِ وفا نکھارنے والا ، نہ تُو نہ میں
اپنی انا کو مارنے والا ، نہ تُو نہ میں

دونوں بلا کے چرب زباں ہیں، یقین کر
زُلفِ عمل سنوارنے والا ، نہ تُو نہ میں

اوڑھے ہوئے لبادۂ صدق و صفا ، مگر
حق ہُو ، بہ دل پکارنے والا ، نہ تُو نہ میں

جس کو ترس رہی ہے اداکاریٔ خرد
سچّا وہ رُوپ دھارنے والا ، نہ تُو نہ میں

کٹتی ہے جس جگہ پہ زباں، لب کشائی پر
شیخی وہاں بگھارنے والا ، نہ تُو نہ میں

خوابوں سے ہمکنار ہو تعبیر کس طرح
بازی جنوں کی ہارنے والا ، نہ تُو نہ میں

جس کو اجل بھی دیکھتی ہے چشمِ رشک سے
وہ زندگی گزارنے والا ، نہ تُو نہ میں

آرائشِ حیات کی منزل بعید ہے
دل جھونپڑی اُسارنے والا ، نہ تُو نہ میں

شعر و سُخن میں آ نہیں سکتا اثر کبھی
ملّت پہ جان وارنے والا ، نہ تُو نہ میں

فوکس تو ہے نمود و نمائش پہ جانِ من
اخلاص پر اُبھارنے والا ، نہ تُو نہ میں

فیضانؔ، آسمان بھی ہٹ جائے راہ سے
ایسی اُڈاری مارنے والا ، نہ تُو نہ میں

فیض رسول فیضان

غزل

خواب گر لوگ خواب ہونے لگے
اب تو موسم عذاب ہونے لگے

اس کی آنکھیں تو اس کی آنکھیں ہیں
اب تو پانی شراب ہونے لگے

رقص کرنے لگیں جواں سوچیں
اور جذبے رباب ہونے لگے

حاشیے میں جو بار پاتے تھے
آج وہ انتساب ہونے لگے

ریگ زاروں پہ کیا عروج آیا
سب کے سب آفتاب ہونے لگے

راز دنیا پہ کھل گیا اصغر
وہ مرا انتخاب ہونے لگے

اصغر علی بلوچ

غزل

خواہشِ انجمنِ جام و طرب ہے ہی نہیں
سچ بتاؤں تو کوئی دل میں طلب ہے ہی نہیں

لاکھ بتلاتا ہوں پھر بیچ میں لے آتے ہو
مسلکِ عشق میں یہ نام و نسب ہے ہی نہیں

حیف صد حیف یہاں کوئی گنہگار نہیں
کیسی محفل ہے طلب گار و طلب ہے ہی نہیں

نہیں معلوم کہ غمگین ہوں کس کی خاطر
مسئلہ یہ ہے کوئی غم کا سبب ہے ہی نہیں

عہد و پیمان ، شکایات ، جنوں ، میخانے
عقل والوں کے نصیبوں میں یہ سب ہے ہی نہیں

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چھنک اُٹھے ہیں مرے حلق میں وہی گھنگھرو
بس ایک سانس بچا ہے مری رہائی میں

غزل

ایک فرقے سے نکل کر جو گیا دوسرے میں
اِک کُنویں سے وہ نکل کر ہے گرا دوسرے میں

باغِ دِل میں کبھی اپنے یہ کلی کِھلنے نہ دی
ہم نے ڈھونڈی ہے ہمیشہ ہی وفا دوسرے میں

ہم گریبان میں اپنے نہیں دیکھا کرتے
ہم کو آتی ہے نظر ساری خطا دوسرے میں

اپنی خامی بھی نہیں مانتے ناکامی پر
یہ نہیں دیکھتے ہم خُوبی ہے کیا دوسرے میں

مذہبی لوگ ہیں ہم اور یہی جانتے ہیں
اِک جہاں میں ہے فنا اور بقا دوسرے میں

ایک ہی وقت میں سب کام کہاں مُمکن ہے
جس کو پہلے میں تھا چھوڑا، وہ کیا دوسرے میں

پہلے مِصرعے میں تو ہر بات اُدھوری نِکلی
ہم پہ اشعار کا مضمُون کُھلا دوسرے میں

رِشتے، رِشتوں کو مِلانے سے نئے بنتے ہیں
ہم نے دیکھا ہے ہر اِک رنگ مِلا دوسرے میں

ہم نے ہر شخص کو آئینہ ہی سمجھا کیفی !
ہم نے تو خُود کو ہی دیکھا ہے سدا دوسرے میں

محمود کیفی

غزل

ہم اگر یونہی جدا ہو جائیں
قید الفت سے رہا ہو جائیں

ہم اندھیروں سے الجھ کر شاید
صبحِ ارماں کی ضیا ہو جائیں

وہ جنھیں اِذنِ پرستش نہ ملا
ان کے ہونٹوں کی دعا ہو جائیں

بڑھتی جاتی ہے عقیدت اُن سے
یوں نہ ہو وہ بھی خدا ہو جائیں

ہم ستم جھیلنے والے محسن
اب زمانے کی صدا ہو جائیں

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جدائی میں بھی ہم اک دوسرے کے ساتھ رہے
کڈھب رہا نہ وہ خالد سنور گئے ہم بھی

غزل

رہنے کو جو اک دشت میں گھر ڈھونڈ رہے ہیں
ہم خود میں اذیت کا ہنر ڈھونڈ رہے ہیں

کل تک تھا جنھیں آبلہ پائی پہ بہت ناز
وہ لوگ بھی صحرا میں شجر ڈھونڈ رہے ہیں

ہر سمت محبت کے گلابوں کی مہک ہو
آشاؤں کا اک ایسا نگر ڈھونڈ رہے ہیں

دیوار تو دونوں نے ہی مل کر تھی اٹھائی
اب دونوں ہی دیوار میں در ڈھونڈ رہے ہیں

تا عمر جفاؤں کے جو بوتے رہے کانٹے
وہ اپنی وفاؤں کا ثمر ڈھونڈ رہے ہیں

ہر کوچہ و بازار میں غربت کے تماشے
زردار مرے دیس میں زر ڈھونڈ رہے ہیں

اشفاق بہت ڈوبنے کو دل ہے یہ بے تاب
آنکھوں کے سمندر میں بھنور ڈھونڈ رہے ہیں

محمد اشفاق بیگ

غزل

میں جانتا ہوں خدا کی قسم نہیں ہوتا
منافقوں پہ خدا کا کرم نہیں ہوتا

ہم ایسے پیڑ توجہ کا پانی مانگتے ہیں
ہماری آنکھ کے صحرا میں نم نہیں ہوتا

یہ بے وفائی کی برچھی کا درد ہے پیارے
تمھارے لوٹ کے آنے سے کم نہیں ہوتا

کوئی کتاب، کوئی شخص ہی دکھائے مجھے
وہ نظریہ جو جہالت میں ضم نہیں ہوتا

تمھارے لمس کی بابت میں اتنا جانتا ہوں
وجود ہوتا ہے اِس کا عدم نہیں ہوتا

خالد ندیم شانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تائب کے حفیظ، ندیم کے مان، گوہر پہ نگاہ نجیب سمان
ہم لوگ پسِ دیوارِ کرم اے انجمن آرا بیٹھ رہے

غزل

کچھ اس لیے نہ بن سکے پہچان راستے
ہم نے چنے تھے پیار کے انجان راستے

منصف کو ذاتیات سے فرصت نہ مل سکی
اہلِ جفا نے کر دیے ویران راستے

بچھڑے تو پھر نہ مل سکے ایسے جدا ہوئے
میں اور میرے شہر کے سنسان راستے

رخصت کیا تو باپ نے بیٹے کو دی دعا
مالک کرے سبھی ترے آسان راستے

اذنِ سفر ملا تو منازل کی ٹھان لی
پھر راستوں نے ہم کو کیے دان راستے

اب تک ہیں مجھ کو یاد وہ گیسو، وہ سرخ لب
وہ وارداتِ عشق کا عنوان راستے

ساجد انا کے شہر میں کچھ ہجرتوں کے بعد
باندھے ہیں ہم نے پشت پہ ہر آن راستے

سجاد حسین ساجد

غزل

کیسا جسیم ہے دل جو عشق گیر بھی ہے
جو امن لکھ رہا ہے جنگ کا سفیر بھی ہے

ہنستا ہے فیصلے کی تعزیر ثبت کر کے
منصف بے عدل تو ہے ہی کچھ شریر بھی ہے

اُمتے ہی جا رہے ہیں پچھلے پڑاؤ سارے
میری تلاش میں کوئی جم غفیر بھی ہے

میں نے ضروری خواہش کو ڈھونڈتے یہ جانا
سوچوں کی اس تھکن میں کوئی ضمیر بھی ہے

آمین کہہ رہے ہیں تیری دعا پہ جھونکے
سچ بول! حبس خانے میں تو اسیر بھی ہے؟

میں تیری بے وفائی کیسے معاف کر دوں
تاریخ پڑھ ، بتا کیا ایسی نظیر بھی ہے

تکلیف اس لیے بھی محسوس نہیں ہوتی
اب درد بانٹنے والوں میں ظہیر بھی ہے

ساگر کوئی رکاوٹ ہے یا کہ فیصلہ یہ
پتھر ہے راہ میں اور اس پر لکیر بھی ہے

ساگر حضور پوری

غزل

کہاں کسی کو زمانے نے آسرا دیا ہے
جو لڑکھڑایا اُسے خاک میں ملا دیا ہے

اکٹھے چلتے تو یہ فاصلہ زیادہ نہ تھا
تمہاری تیز روی نے اِسے بڑھا دیا ہے

نصابِ شوق بدلنے سے فرق کیا پڑتا!
سبق ہی ایسا ہمیں وقت نے پڑھا دیا ہے

اس اتصال کا امید سے بنا امکان
حقیقتوں سے مجھے خواب نے ملا دیا ہے

عنایتوں سے محبت کی کیا کریں انکار
فنا نصیب کو بھی جادۂ بقا دیا ہے

کچھ ایسے رنج مسلسل اٹھائے ہیں جاذبؔ
مجھے کسی کی ہنسی نے بہت رلا دیا ہے

اکرم جاذب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک اک بات تمھیں بتلا دی اب آگے تم جانو
وہ بھی جواب نہیں دیتے ہیں، تم بھی سوال نہ کرنا

غزل

حرف و بیان و صوت کی ترسیل ہو چکی
حاکم کو حکم ہو چکا، تشکیل ہو چکی

کس خواب میں پڑے ہو مرے خوش خیال دوست
بستی تمام حشر میں تبدیل ہو چکی

تم کو دکھائی دیتا ہے کچھ اور ہی میاں
ہر آنکھ جھیل ہو چکی ، تحلیل ہو چکی

تو خاک میری بات کرے گا اِدھر ادھر
تیری تو اپنے گھر میں ہی تذلیل ہو چکی

نازش تمھارے خوف تو تعبیر ہو چکے
نازش تمھاری آنکھ تو تمثیل ہو چکی

شبیر نازش

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

کچھ سانس بچ رہے تھے سو وہ سانس بھی لیے
وعدہ خلاف تھے ، سو ترے بعد جی لیے

غزل

یہ کب کہا تھا کہ خاکداں یہ تمہیں چمکتا ہوا ملے گا
ہمارے گھر کے دیوار و در پر اندھیرا لپٹا ہوا ملے گا

ہمیں دکھوں کو سنبھالنے کا سلیقہ آیا خزاں رُتوں سے
ہمارے گھاؤ ہرے بھرے اور دل بھی ٹوٹا ہوا ملے گا

محبتوں کی قدیم گلیوں میں اب بھی ہلکی سی روشنی ہے
کہ ایک تنہا اداس تارہ وہاں چمکتا ہوا ملے گا

تم اپنے آنسو، دکھوں کے قصے، ہماری آنکھوں کو سونپ جاؤ
یقین مانو ہر ایک آنسو تمہیں سنبھالا ہوا ملے گا

ہمیں چھلکتی سی آنکھ دے کر کیوں چشمِ حیرت سے دیکھتے ہو؟
اے دستِ کوزہ گراں یہیں پر الاؤ جلتا ہوا ملے گا

فلک نشینو! ہمیں تو ہجرت وراثتوں میں عطا ہوئی ہے
ہمارے جد میں تمہیں فلک سے زمیں پہ آیا ہوا ملے گا

غبارِ شب میں ہتھیلیوں پر ہمارے آنسو بھی ساتھ رکھنا
مسافتوں میں ہر ایک موتی تمہیں ستارہ ہوا ملے گا

یہ شب گزیدوں کی بستیاں ہیں یہاں پہ بابر دیے جلاؤ
دیے جلاؤ کہ پرلی جانب کوئی تو ٹھہرا ہوا ملے گا

احمد سجاد بابر

غزل

دور رہتا بھی نہیں پاس آتا بھی نہیں
میرے محور سے نکل پائے ایسا بھی نہیں

آگے بستی ہے کوئی اور صحرا بھی نہیں
مڑ کے دیکھوں تو وہ شہرِ تمنا بھی نہیں

سامنا تجھ سے جو ہو، مجھ سے دل الجھے نہیں
عمر کے پچھلے پہر، حال ایسا بھی نہیں

مجھ پہ چھایا ہے وہ ابرِ مسلسل کی طرح
خشک گزرا بھی نہیں، کھل کے برسا بھی نہیں

بزمِ عشاق میں ہم یوں بھی ممتاز رہے
تیرے مقبول نہیں، تیرے رسوا بھی نہیں

اول اول کا گماں، رفتہ رفتہ کا یقیں
وہ جو خوابوں میں نہیں آتا، ملتا بھی نہیں

کیسے مانوں میں شجر دشتِ الفت کا اُسے
با ثمر بھی جو نہیں، جس کا سایا بھی نہیں

صوت ہی کی ہی سہی، شکل کا ہونا حبیب
تم نے سمجھی ہے یہ دنیا تو ایسا بھی نہیں

بشیر احمد حبیب

غزل

پہلے ہی بڑھ چکے ہیں اذیت کے سلسلے
ایسے میں اک اداس غزل کون سن سکے

کیسے کہوں جنوں کا عجب ہی مقام ہے
کچھ لطف وصل میں ہے نہ اب ہجر سلسلے

تنہائی میں یہی تو مرے کام آئیں گے
تصویر کر رہا ہوں جبھی تیرے قہقہے

صحراؤں اور ساحلوں کی وحشتوں کے بعد
دیکھا ہے خود کو خواب میں افلاک سے پرے

وہ صرف میری ذات سے تقطیع کب ہوا
ویران کر گیا میرے گلشن ہرے بھرے

اُس حُسن کے خمار کا اندازہ کیجئے
حسرت سے دیکھتے ہوں جسے گھر میں فاصلے

کیا ہو گا اختتام ملاقاتِ ہجر کا
جاتی سے ملنے آئے ہیں کچھ لوگ دل جلے

مستحسن جامی

غزل

غنی الرحمٰن انجم

اب جو آئی ہے تو ویسے نہیں جانے والی
تیز بارش میں ہوا شور مچانے والی

وہ جو روٹھا ہے تو افسوس مجھے ہے لیکن
بات کوئی بھی نہ تھی روٹھ کے جانے والی

ایک صورت نے پریشان کیے رکھا ہے
ایک صورت ہے مری نیند اڑانے والی

ہم مزاجی کا یہ عالم ہے کہ اک دوجے سے
بات کرتے ہی نہیں بات بڑھانے والی

ساری دنیا سے الگ اُس کی طبیعت انجم
کوئی عادت ہی نہیں اُس میں زمانے والی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

روئی کے گالوں کی چادر بچھ گئی اس سال بھی
ایسا لگتا ہے کہ یہ بادل بھی بارانی نہیں

غزل

تیرگی بے لباس ، کمرے میں
بن گئی ہے ہِراس کمرے میں

قید احساسِ گل نہیں ہوتا
پھیل جاتی ہے باس کمرے میں

جو مُقفّل رہا یہ دَر یوں ہی
گھر بنا لے گی گھاس کمرے میں

نِصف شب ، خواب میں خیال ترا
آگیا بے قیاس کمرے میں

اِک دریچے سے جھلملاتا ہے
روشنی کا نِکاس کمرے میں

لب تھے محروم لب کشائی سے
جسم تھا بے حواس کمرے میں

سانس تازہ ہَوا کا طالِب تھا
حَبس آیا نہ راس کمرے میں

گرد آلود ہیں کتابیں سب
مَر رہی ہے اُساس کمرے میں

رات ہوتے ہی جاگ جاتا ہے
ایک شاعر شناس کمرے میں

دیکھ کر حادثہ خیالی اِک
بِکھر رہا ہوں اداس کمرے میں

زبیر خیالی

غزلیں

چشمِ افلاک کے بے مہر ستارے آئے
میرے حصے میں محبت کے خسارے آئے

دشتِ ہجراں میں بھلا شوق سے آتا ہے کوئی
جو بھی آئے تھے کسی زعم کے مارے آئے

دل تو ویسے بھی ہے اک کارِ زیاں پر مائل
پر میں کہتا ہوں کہ یہ کام تمھارے آئے

مجھ پہ چلتا تو نہیں کارِ مسیحا پھر بھی
گردِ احساسِ تمنا کو اتارے، آئے

باپ مرتا ہے تو پھر خواب بھی مر جاتے ہیں
پھر نہ معصوم سے بچے کے غبارے آئے

کوئی تو ایک سہارا بھی کہیں سے آتا
میرے تو یار نہ دریا نہ کنارے آئے

میں تو ہوں عشق کے ابہام کا مارا انصر
کوئی اپنا ہے تو پھر نام پکارے، آئے

انصر منیر

مری بصارت کی سب طنابیں ہی کٹ گئی ہیں
یہ میری آنکھیں تمھارے چہرے سے ہٹ گئی ہیں

جہاں پہ تم نے یہ طے کیا تھا کہ ہم جدا ہیں
تمھاری یادیں وہیں سے ہو کر پلٹ گئی ہیں

ہمارے دل میں تو دھڑکنوں کا سبب بھی تو تھا
یقین کر لو کہ اب وہ گنتی میں گھٹ گئی ہیں

یہ میری سوچیں تمھاری قربت پہ مرتکز تھیں
جو تم گئے ہو تو کتنے حصوں میں بٹ گئی ہیں

بصارتیں بھی نہ اس تحیّر کی تاب لائیں
مگر وہ چہرہ کہیں کہیں سے تو رٹ گئی ہیں

میں چاہتا تھا کہ خود کو اس کے خلاف کر لوں
کہ اس کی یادیں انا کے رستے میں ڈٹ گئی ہیں

غزل

کاغذی کشتیاں بنانے میں
کٹ گئی عمر جی لگانے میں

اب نہ دل ہے نہ درد باقی ہے
تُو ملا بھی تو کس زمانے میں

اک بھرم تھا سو وہ بھی ٹوٹ گیا
کیا ملا تجھ کو آزمانے میں

کچھ تو کردار آپ کا بھی ہے
درمیاں فاصلے بڑھانے میں

سارے موسم گزر گئے مجھ میں
دیر کر دی نا مجھ تک آنے میں

صاف دھڑکن سنائی دیتی ہے
جیسے دل ہے مرے سرہانے میں

نیند یا خواب کے جھروکوں میں
میں کہاں ہوں ترے فسانے میں

رائگاں کر دی ہم نے بھی تو سحر
زندگی روٹھنے منانے میں

نادیہ سحر

غزلیں

کیا خاک خود کو اڑانے کی خاطر
وہی روگ دل کے مٹانے کی خاطر

رہی ہے مچل کب سے وحشت یوں دل کی
نیا شور اندر مچانے کی خاطر

مری مسکراہٹ کا کیا پوچھتے ہو
یہ ہے زخمِ دل کو چھپانے کی خاطر

پلا اپنی آنکھوں سے الفت کی صہبا
نہیں آیا پیاسا میں جانے کی خاطر

گرا ہوں کبھی کھا کے ٹھوکر اگر تو
نہیں آیا کوئی اٹھانے کی خاطر

عبدالرؤف زین

جس موسم میں مرنے لگا ہوں میاں
رات گہری سے ڈرنے لگا ہوں میاں

زندگی ایسے کیسے کٹے گی بھلا
بات بے بات لڑنے لگا ہوں میاں

عشق مجھ سے کوئی کیوں کرے گا بھلا
بات جو حق کی کرنے لگا ہوں میاں

دو سہارا مجھے ہجر میں جاں گئی
درد سے اب بکھرنے لگا ہوں میاں

کیسے انصاف ہو گا مرے ملک میں
عدل کہتا ہے سڑنے لگا ہوں میاں

میں تو مر کے بھی زندہ رہوں گا سنو
رنگ شعروں میں بھرنے لگا ہوں میاں

غزل

کنایہ ہو کے رہنا ہے، اشارہ ہو کے رہنا ہے
مجھے تاریک راتوں میں ستارہ ہو کے رہنا ہے

تمھارے شہر کی گلیوں میں جلنا اور بجھنا ہے
مجھے جگنو کی صورت اک شرارہ ہو کے رہنا ہے

زمانے میں بنوں گا میں محبت کی مثال ایسی
تمھیں اپنا بنانا ہے، تمھارا ہو کے رہنا ہے

یہی نسبت مجھے کافی، یہی دولت مجھے کافی
تُو راوی ہے مجھے تیرا کنارا ہو کے رہنا ہے

یقیں ہوتا چلا جاتا ہے مجھ کو دم بدم حمّاد
کہ اک دن حسنِ زیبا کا نظارہ ہو کے رہنا ہے

حماد ریاض

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات نواگری بھی کی، صُبح گداگری بھی کی
خالدِ نکتہ سنج نے شہرِ ہنر شکار میں

غزل

رنگِ مزاجِ یار سے جو متصف نہ ہو
محبوب کیا جہان سے جو مختلف نہ ہو

اوڑھی نہ ہو جو صبر و رضا کی بدن پہ شال
بے شک محبتوں کا کبھی معترف نہ ہو

یہ ذہن و دل کے سلسلے ملتے نہ ہوں جہاں
ایسی گلی میں جا کے کبھی معتکف نہ ہو

حاصل رسائی منزلِ دل تک نہ کر سکے
دنیا کے قاعدوں سے اگر منحرف نہ ہو

سمجھے گا یار خاک تقاضے وفاؤں کے
جس پر رضائے دل ہی جیا منکشف نہ ہو

جیا قریشی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنی جوت جگانا خالد اپنے الاؤ بنانا
اپنے عشق میں میرے جیسا اپنا حال نہ کرنا

غزل

مسلسل نامکمل راستوں سے
کسی نے رب کو ڈھونڈا مشکلوں سے

ابھی بھی دل مرا بنجر نہیں ہے
ہرا رکھا ہوا ہے خواہشوں سے

کسے معلوم کیوں کر دیکھتا ہوں
میں ہاتھوں کی لکیریں کچھ دنوں سے

بہت آسان ہوتی جارہی تھیں
پھر اک الجھن نکالی الجھنوں سے

ابھی منزل دکھائی کیسے دے گی
ابھی پالا پڑا ہے رہزنوں سے

یہ آگ اور خون کیسے گوندھتے ہیں
کبھی پوچھے کوئی کوزہ گروں سے

محمد علی ایاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گھل مل چلا تھا شب کے اندھیرے میں اک گناہ
دھیرے سے در کو موجِ ہوا کھٹکھٹا گئی

غزل

ضرورت ہی نہیں اب قربتوں کی
کہ عادت ہو گئی ہے فاصلوں کی

زمیں قدموں کے نیچے جو نہیں ہے
عنایت ہے یہ میرے دوستوں کی

چھپانا سر ہوا جاتا ہے مشکل
نہیں پہچان مجھکو دشمنوں کی

زمانے نے رکھا ہے ٹھوکروں میں
بنی ہوں دھول جب سے راستوں کی

اگر دل میں نہ ہوں یہ رنجشیں تو
حقیقت ہی نہیں کچھ فرقتوں کی

بہا کر خون پایا جس زمیں کو
کریں پھر نظر کیسے تجربوں کی

سبھی کچھ ایک جیسا ہو گیا ہے
نگاہیں منتظر ہیں معجزوں کی

نائیلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنا نہ سکا، تیرے بتائے ہوئے رستے
لیکن ترے مانند کسی کا نہ ہوا میں

غزل

ربط ان سے کچھ زیادہ کر لیا
میں نے مرنے کا ارادہ کر لیا

ہر کوئی اسپِ انا پر تھا سوار
اس لیے خود کو پیادہ کر لیا

بن ترے کوئی تمنا ہی نہیں
اک تمنا کا اعادہ کر لیا

ناز و انداز اس کے میں نے دیکھ کر
دل لگانے کا ارادہ کر لیا

گفتگو میں وہ بڑا تھا مختصر
میں نے بھی اسلوب سادہ کر لیا

غور سے دیکھا اسے تو اس نے بھی
غور کرنے کا ارادہ کر لیا

دیکھ کر شفقت اسے بے راہ رو
رہ پہ لانے کا ارادہ کر لیا

شفقت اللہ مشتاق

غزل

دل کا ہر رابطہ سمجھتے ہیں
ہم ترا دیکھنا سمجھتے ہیں

اس لیے ہم برے ہیں بتلاؤ
ہم بُرے کو بُرا سمجھتے ہیں

ہم پرندوں کو ساتھ لے آئے
جھیل کا مدعا سمجھتے ہیں

عشق تھا ، صبر تھا کہ قربانی
ہم کہاں کربلا سمجھتے ہیں

وصل کیا ہے ؟ تمھیں نہیں معلوم!
چل ، کسی روز آ ، سمجھتے ہیں

قربتیں تو اسی کا پرتو ہیں
ہم جسے فاصلہ سمجھتے ہیں

ہم فقط شعر ہی تو کہتے ہیں
لوگ تو کیا سے کیا سمجھتے ہیں

لوگ منزل سمجھ کے بیٹھے ہیں
ہم جسے راستہ سمجھتے ہیں

تیرے قدموں کی لڑکھڑاہٹ کو
ہم ، ترے زیر پا ، سمجھتے ہیں

گرچہ ہم جانتے ہیں عاصی ہیں
لوگ ہیں! پارسا سمجھتے ہیں

محمد نور آسی

غزلیں

کوئی کسی کے ساتھ ہے کوئی کسی کے ساتھ
لیکن میں بدنصیب، کہ ہوں بے دلی کے ساتھ

تنگ آ گئی ہو مجھ سے بہت، جان کر مجھے
تھوڑی بہت خوشی بھی ہوئی ہے غمی کے ساتھ

وہ اس لیے کہ مجھ سے نہ ہو پائی خودکشی
میں جی رہا ہوں آج اگر شاعری کے ساتھ

کچھ وقت اُس کے ساتھ رہا ہوں سو علم ہے
سفاک دل بھی رکھتی ہے وہ دلکشی کے ساتھ

انجم پڑھو کتاب ظفر کی گل آفتاب
ملتے نہیں ہیں پھول اگر تازگی کے ساتھ

امتیاز انجم

میں چُپ ہُوا تو یار مِرا بولنے لگا
اور اس طرح کہ جیسے خدا بولنے لگا

جس دن سے اُس کی اور کہیں بات چل پڑی
اُس دن سے میں بھی اس کے سوا بولنے لگا

مجھ سے نہ بولتا تھا مگر سُن کے میرا حال
کہتے ہوئے ہُوا سو ہُوا ، بولنے لگا

ایسا بھی کیا کہ سب سے تری رسم وراہ ہو
ایسا بھی کیا کہ جو بھی مِلا، بولنے لگا

کچھ اِس طرح وہ آج یہاں بولتی رہی
پتھر بھی اس کے پاس پڑا بولنے لگا

غزل

آ کے بیٹھا کچھ اس شان سے دفعتاً خاک کے تخت پر
ناز کرنے لگا ہر قدیمی ستارا مرے بخت پر

زرد سیارچے میں معلق خلا باز پہنچا وہیں
جل گئے تھے جہاں پر مقرب فرشتوں کے یلکخت پر

گنبدِ لامکاں کی طرف رقص کرتے قلندر چلے
اور جہاں زاد تکیہ پرانا ترا، ساز پر، رخت پر

باریابی ملی ہے مشینی ذہانت کو دربار میں
تو بھی دستار میں ڈھونڈ سرخاب کا کوئی خوش بخت پر

آخر شب کو جب معرکہ ٹل گیا شاہِ جنات سے
ہم ہوئے خیمہ زن دشتِ ظلمات کے سینۂ سخت پر

عابد رضا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے عشق ! اگر مجھ کو ترا اذن ہو ممکن
آغوش میں لے لوں، ترے پیکر کی مہک بھی

غزل

کِن زمانوں میں ڈھونڈتے ہو مجھے
کِن زمانوں کی شاعری ہُوں میں

کوئی گاتا تھا مجھ کو پچھلے پہر
ٹُوٹے بربط کی راگنی ہُوں میں

آج پھر آئینے سے بات ہُوئی
آج پھر دیر تک ہنسی ہُوں میں

وہ مِری ہر غزل میں شامل تھا
جِس کی باتوں میں سرسری ہوں میں

کیوں مجھے سینت سینت رکھتا ہے؟
کِس کہانی کی اک پری ہوں میں

لوگ کہتے ہیں آفتاب اُسے
ہاں مگر اُسکی روشنی ہُوں میں

عظمیٰ نقوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کھینچ کمانِ حیات نہ خالد
سانس کا تیر نکل جائے گا

غزلیں

اب جو پیروں پہ ہم کھڑے ہوئے ہیں
ایک دنیا سے ہم لڑے ہوئے ہیں

دیکھ ہم کو کہانیاں نہ سنا
ہم اسی شہر میں بڑے ہوئے ہیں

خود کو برباد کر لیا ہم نے
اپنی ضد پر مگر اڑے ہوئے ہیں

کوئی تو ہم کو تھامنے آئے
کوئی دیکھے کہ ہم کھڑے ہوئے ہیں

ایک سادہ سی بات تھی، لیکن
کتنی مشکل میں ہم پڑے ہوئے ہیں

عباس ممتاز

جدائی کے ستم ڈھانے سے پہلے
پلٹ آؤ بکھر جانے سے پہلے

خوشی تھی، رنگ تھے، رعنائیاں تھیں
تمہارے شہر میں آنے سے پہلے

ابھی بھی وقت ہے تم لوٹ آؤ
مرے دل سے اتر جانے سے پہلے

ہمیں رنگوں کی یوں پہچان کب تھی
تمہارے رو بہ رو آنے سے پہلے

مجھے بھی زعم تھا غزلوں پہ اپنی
تری آنکھوں میں کھو جانے سے پہلے

کہاں تھے کیا تھے شاید کچھ نہیں تھے
تری نظروں میں ہم آنے سے پہلے

غزل

کچھ خاص خواہشات سے صرف نظر کیا
خود سے گریز بنتا نہیں تھا، مگر کیا

خودداریوں کی اوٹ میں کیا جانے کس طرح
ہم نے بھی ایک ساتھ بہت دن سفر کیا

سورج نے یہ جو ہم سے رعایت کبھی نہ کی
صحرا نے کون روز یہاں درگذر کیا

کیا کہیے کون لوگ تھے منظر کی اوٹ میں
دیوانہ وار ہم نے سفر در سفر کیا

آہٹ سی کوئی دھیان میں گونجی تھی ایک روز
دل نے کسی گماں میں ہمیں در بہ در کیا

اہلِ زمانہ اور طرف اور میں اور سمت
اِک طرفہ ماجرے نے مجھے بے خبر کیا

کچھ کچھ معاملات تو کھلتے چلے گئے
ٹھہرے ہوئے پلوں میں جو ہم نے سفر کیا

کہتے ہیں کچھ تو خیر سے کرتے ہیں اور کچھ
راہیں بھی حیرتی ہیں کسے راہ بر کیا

لوگوں کی داستان سرائی پہ کیا کہوں
اک معرکہ وجود کا میں نے بھی سر کیا

آئینہ وار رات اُسے جا چھوا نوید
رسوا اِسی خطا نے ہمیں سر بہ سر کیا

نوید صادق

غزل

دیر سے ہے اِک صدا، دُکھ جاگتے ہیں
زندگی دے آسرا ، دُکھ جاگتے ہیں

ہوش میں کٹتے نہیں ، شام و سحر بھی
ضبط ہے نالہ رسا ، دُکھ جاگتے ہیں

بیچ کمرے میں کہاں آوارگی ہے
سانس ہے اکھڑا ہُوا ، دُکھ جاگتے ہیں

کیا زمانے سے چھپائیں درد اپنا
کہہ رہے ہیں برملا ، دُکھ جاگتے ہیں

چارسُو پھیلا ہوا ہے اک دھواں
تیرگی ہے جابجا ، دُکھ جاگتے ہیں

زلف کی زنجیر سے آزاد ہُوں اب
دیکھ آکر مہ وشا ، دُکھ جاگتے ہیں

راستے سنسان ہیں نعمان پھر سے
چاند نے بھی کہہ دیا ، دُکھ جاگتے ہیں

نعمان منظور

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا ''افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو، سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانح عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

بجٹ تقریر: ایک دن میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ سیکرٹری فنانس طارق فاروق کا فون آ گیا۔ بولے ''شاہ صاحب! فوراً میرے دفتر پہنچیں، ایک ضروری کام آن پڑا ہے۔ سیکرٹری فنانس کو مجھ سے کیا کام پڑ سکتا ہے۔ یہ سوچتا ہوا جب میں شام کو ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ اور ایڈیشنل سیکرٹری سمیع سعید سر جوڑ کر کھسر پھسر کر رہے تھے۔ کہنے لگے ''پرسوں بجٹ تقریر ہے۔ وزیر موصوف نے کہا ہے کہ تقریر شاہ صاحب لکھیں گے۔'' مجھے مزید حیرانی ہوئی۔ عرض کیا ''فنانس نہایت خشک مضمون ہے۔ بجٹ آپ نے بنانا ہے، میں کیا کر سکتا ہوں۔''

بولے ''بس یہی خشکی تو دور کرنا ہے۔ آپ فگرز کی چنتا نہ کریں وہ ہم ایڈجسٹ کر لیں گے۔ آپ صرف پہلا اور آخری حصہ لکھ دیں۔ بس تقریر ایک دم دھانسو ہونی چاہئے۔ اپوزیشن کے چھکے چھوٹ جانے چاہئیں۔ انہیں ''کچی'' مار نہیں دینی، ہمارے وزیر صاحب کے ہاتھ میں الفاظ کا بنٹر ہونا چاہئے۔''

میں قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ گیا۔ میرے دائیں جانب طارق فاروق اور بائیں سمت سمیع سعید تھے۔ ہم ساری رات جاگتے رہے۔ صبح پانچ بجے میں نے تقریر مکمل کی اور ان کے حوالے کر کے گھر چلا آیا۔

بجٹ تقریر کو عمومی طور پر بہت پسند کیا گیا۔ روزنامہ نوائے وقت نے لکھا ''یہ پہلی بجٹ تقریر تھی جس میں ادبی چاشنی تھی۔ چیف منسٹر کے سیکرٹری جاوید محمود نے سمیع سعید سے پوچھا ''اس قدر عمدہ اُردو تم نے کہاں سے سیکھی ہے؟''

بولا ''کیا سروس میں چھپے رستم نہیں ہوتے۔''

اس تمام عرصے میں مجھے ایک بات پر فخر رہا۔ مزدور بھائی مجھے خاص طور پر مدعو کرتے۔ بشیر بختیار لیبر ہال میں کوئی ایسا فنکشن نہ ہوتا جس میں میں شرکت نہ کرتا۔ جب بھی باہر سے لیبر لیڈر آتے خورشید صاحب کا فون آ جاتا۔ وہاں مجھے احساس ہوا کہ لاہور آرٹس کونسل کے الحمرا ہال میں کسی ادبی محفل سے خطاب کرنا آسان ہے مزدور سے ہم کلام ہونا مشکل ہے۔ ان سے بات کرتے وقت کوئی ملمع یا ریاکاری نہیں ہوتی۔ ان کی سطح پر اُتر کر ان کی زبان میں بات کرنا پڑتی ہے۔ ان سے مسلسل رابطے رکھنے کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ نہ صرف ان کے مسائل کا ادراک ہوا بلکہ افہام و تفہیم کی فضا بھی پیدا ہوئی۔ جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوا، ہم اُسے بطریق احسن نبٹا دیتے۔

خورشید احمد نہایت منجھا ہوا لیبر لیڈر ہے۔ جنیوا میں آئی سی او کے اجلاس میں پاکستان کی نمائندگی کرتا ہے۔ متمول ہونے کے باوصف سکوٹر استعمال کرتا ہے، کار میں نہیں بیٹھتا، کھدر پہنتا ہے۔ غالباً اس کے پائے کا لیبر لیڈر پاکستان میں نہیں ہے۔ بشیر بختیار مرحوم کا داماد ہے اور انہی کا تربیت یافتہ ہے۔ ایک تسلسل سے ان کی یونین الیکشن جیتتی آئی ہے۔ لاء گریجویٹ ہے۔ تمام دنیا کی لیبر فیڈریشنوں کے ساتھ ان کا الحاق اور رابطے ہیں۔ دنیا کا کوئی ایسا لیبر لیڈر نہیں جس نے بشیر بختیار ہال میں مزدوروں سے خطاب نہ کیا ہو۔ ایسے معاملہ فہم اور زیرک لیڈر کو میں کیا مشورہ دیتا۔ اب جب آ ہی گئے تھے تو بات کرنا ضروری تھی ''آپ بالکل دھمکی میں نہ آئیں۔ احمد صادق ایسا بیورو کریٹ ہے جس نے اپنی سب کشتیاں جلا ڈالی ہیں صرف جاندار دبکا مارنا جانتا ہے اس کے پاؤں مٹی کے اور رول گیئر کا ہے۔

اگر آپ مان گئے یا احتجاج نہ کیا تو کل آپ کے مخالفین کو تنقید کا موقع مل جائے گا۔ آج تک وہ کوئی کمزوری تلاش نہیں کر سکے۔ آپ پر ملی بھگت اور نمک مکاؤ کا الزام بھی لگ سکتا ہے۔ یونین اپنا دامن داغدار نہ کرے تو بہتر ہے۔"

شاید وہ یہی باتیں میرے منہ سے سننا چاہتے تھے۔ بہت خوش ہوئے اور وعدہ کیا کہ چاہے احمد صادق اُلٹا ہی کیوں نہ ہو جائے ہم اس کے ڈراوے میں نہیں آئیں گے۔

یوم مئی: یوم مئی آیا تو حکومت کی جانب سے اُسے سرکاری سطح پر منانے کا انتظام ہوا۔ پنجاب کے علاوہ سندھ، بلوچستان اور سرحد سے بھی لیبر لیڈر مدعو کیے گئے۔ ان میں اکثریت کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا۔ صدارت لیبر منسٹر لنگڑیال صاحب کی تھی۔ مقصد محض شکاگو کے مزدوروں کو خراج عقیدت پیش کرنا نہ تھا، حکومت سیاسی فائدہ اُٹھانا چاہتی تھی جو خونِ خاک نشیناں رزق خاک ہونا تھا، سو ہو گیا، دنیا کی حکومتیں اُس کی آڑ میں اپنے آپ کو مضبوط اور مستحکم کرنا چاہتی تھیں۔ پیپلز پارٹی مزدوروں کو اپنا ہراول دستہ سمجھتی تھی۔

اتفاق سے پہلی تقریر میری تھی۔ میں نے عدل اور ظلم پر تقریر کر ڈالی۔ ان محرومیوں، مجبوریوں، تلخیوں اور زیادتیوں کا ذکر کیا جو مزدوروں پر روا رکھی جا رہی تھیں۔ حکومت کا نام لئے بغیر اسے ہر قسم کی لغزشوں، زیادتیوں، کوتاہیوں اور ناروا پابندیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ بے خیالی میں تقریر کی Pitch بہت اُونچی ہو گئی۔ ماحول گرم ہو گیا۔ ہر مزدور لیڈر نے اپنی تقریر میں اپنی ہی حکومت کو لتاڑ ڈالا۔

فنکشن تو ختم ہو گیا لیکن میری کم بختی آ گئی۔ بیوروکریسی نے فنکشن کے فلاپ ہونے کا الزام میرے سر تھوپ دیا۔ لنگڑیال صاحب بھلے مانس آدمی تھے۔ سمجھ گئے کہ نزلہ بر عضو ضعیف گرا چاہتا ہے۔ انہوں نے درمیانی راستہ نکالا۔ میری زبان بندی ہو گئی اور آئندہ سرکاری فنکشنوں کے لئے بلیک لسٹ کر دیا گیا۔

جادوگرنی، سروش سلطان: ایک دن اچانک خبر آئی کہ میرا تبادلہ ہو گیا ہے۔ بندیال صاحب نے مجھ سے پوچھا آیا میں نے خود تو نہیں کرایا۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ انہوں نے چیف سیکرٹری کو فون کر کے تبادلہ رکوا دیا۔ پتہ چلا کہ تبادلہ سروش سلطان اور نصر اللہ دریشک نے کرایا ہے۔ وہ کمشنر سوشل سیکورٹی تھی اور مجھے اپنے راستے کی بہت بڑی رکاوٹ سمجھتی تھی۔ پوری سول سروس میں، اس قماش، مزاج اور ذہن کی کوئی عورت تو چھوڑ مرد بھی نہ تھا۔ تند خو، ضدی، ذہین اور دلیر تھی۔ ایک کوآپریٹو سوسائٹی میں خرد برد کر کے خود تو بچ گئی سیکرٹری بخاری کو نوکری سے نکلوا دیا۔ اس نے ہائی کورٹ سے

حکم امتناعی حاصل کر کے منسٹر اور سیکرٹری کا اپنے دفتر میں داخلہ بند کرا دیا۔ ڈیڑھ سو ڈاکٹر اور نرسیں بھرتی کر لیں اور کسی کو گھاس تک نہ ڈالی۔ یہ لائل پور کے چوہدری سلطان علی کی بیٹی تھی۔ والد صاحب نے شاہی مسجد کے مینار سے کود کر خودکشی کر لی تھی۔ کسی صحافی نے وجہ پوچھی تو بولی جس دن تمہارے باپ نے دریائے راوی میں چھلانگ لگائی اس دن بتاؤں گی۔ جن دنوں انڈر ٹریننگ تھی اکثر میرے دفتر میں گپ شپ کے لئے آ جاتی۔ میں تو کسی طور بچ گیا لیکن لائل پور میں ایک ایس پی پر الزام لگا کر نوکری سے نکلوا دیا۔

مجھ سے ناراضی کی فوری وجہ یہ ہوئی کہ لیبر ڈیپارٹمنٹ کے فنڈز سے سوشل سیکورٹی سکول چلا رہی تھی۔ محکمہ نے فیصلہ کیا کہ وہ خود سکول چلائے گا کیونکہ فنڈز کے خرد برد ہونے کی اطلاعات آ رہی تھیں۔ میٹنگ ہوئی تو وہ پھٹ پڑی۔ خلیل بھٹی جیسے گھاگ شخص کو بھی بیک فٹ پر لے آئی۔ غصے میں آ کر اس قدر سکڑی سمٹی چیخی اور چلائی کہ ہاتھ میں پہنی ہوئی انگوٹھیاں انگلیوں سے نکل کر چھت سے جا ٹکرائیں۔ سیکرٹری کو کہنے لگی ''تم ہوتے کون ہو یہ فیصلہ کرنے والے۔ اگر میں کرپٹ ہوں تو تم کون سے ایماندار ہو۔ میں دیکھوں گی محکمہ کیسے فیصلہ نافذ کرتا ہے، میں تم سب کو عدالت میں لے جاؤں گی۔''

بڑی عجب صورت حال پیدا ہو گئی۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ اپنی حد میں رہ کر بات کرو اور عورت ہونے کا ناجائز فائدہ نہ اُٹھاؤ۔'' کہنے لگی ''میں تمہیں بھی دیکھ لوں گی۔''

وہاں سے اُٹھی تو خاوند کو لے کر چیف سیکرٹری کے پاس پہنچ گئی۔ وہ ممبر قومی اسمبلی تھا لیکن بیوی سے جان جاتی تھی۔ دوسری شادی جو تھی۔ ایک دن اس نے چھاپہ مار کر خاوند محترم صاحب کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ ان کے دفتر میں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ کسی نے بعد میں کہا ''مرد تھوڑا بہت موج میلہ تو کرتے ہی رہتے ہیں، تمہیں یوں سرعام خاوند کو رُسوا نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

بولی ''مجھے اس کے تعلقات پر تو زیادہ اعتراض نہ تھا۔ غصہ اس بات پر آیا کہ باپ بیٹا ایک ہی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں۔''

آج کل انکوائری سے بچنے کے لئے ملک چھوڑ گئی ہے اور آسٹریلیا میں مقیم ہے۔

بطور ایڈیشنل سیکرٹری مجھے کئی دفعہ بیرون ملک جانا پڑا۔ محکمہ محنت بہت وسیع ہے۔ اس کے ماتحت کئی ذیلی ادارے میں، سوشل سیکورٹی، مین پاور اینڈ ٹریننگ ونگ جو کئی ٹیکنیکل سکول چلا رہا تھا۔ کچھ کارخانے بھی اس کی نگرانی میں چل رہے تھے۔ اس کے علاوہ سارے صوبے میں لیبر لاز کا نفاذ بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ سیکرٹری اور

ایڈیشنل سیکرٹری بلحاظ عہدہ جوڈیشل افسر بھی ہیں۔ وہ ماتحت عملے کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں سنتے ہیں۔ اس سلسلے میں دو واقعات قابل ذکر ہیں۔

موٹروے کا ٹھیکہ کورین فرم ڈائیو کو مل گیا تو اس پر امریکنوں نے بہت احتجاج کیا۔ پراجیکٹ کو ہنگامی بنیادوں پر چلانے کا فیصلہ ہوا تو میاں نواز شریف نے ٹھیکیداروں کی درخواست پر لیبر قوانین کے وہ حصے معطل کر دیے جن کا تعلق انجمن سازی سے تھا۔ قانونی طور پر لیبر یونین ہڑتال نہ کر سکتی تھی۔ گو پراجیکٹ پر کام کرنے والے مزدوروں کی تنخواہ دیگر ورکرز کی نسبت دگنی تھی لیکن امریکنوں کی انگیخت پر یونین لیڈر مالکان کو زچ کرنا چاہتے تھے۔ پہلا گل تو معین قریشی نے آتے ہی کھلایا۔ اس نے بیک جنبش قلم چھ لین کو چار لین میں تبدیل کرنے کا حکم دیا۔ اس پر سارے ملک میں صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ قومی پریس نے بھی اسے ہدف تنقید بنایا۔ Earth work اور Compaction ہو چکی تھی۔ اس سے مالی طور پر ایک دھیلے کی بچت نہ ہونی تھی۔ معاہدے کی رو سے حکومت پوری رقم ادا کرنے کی پابند تھی۔ اس سے ہی اُس کی بدنیتی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ایجنٹ مالک کے اشارے پر ناچتے ہیں اپنا ذہن استعمال نہیں کرتے۔ امریکن پریشر بڑھا کہ لیبر لاز کا مکمل نفاذ ہونا چاہئے۔ کسی کو یونین بنانے یا یونین کو راہ میں روڑے اٹکانا غیر قانونی ہے۔ اس سلسلے میں امریکہ سے ایک وفد آیا۔ ہمیں ان کے حضور پیش کیا گیا۔ وہ اس طرح سوال پوچھ رہے تھے جس طرح حاکم محکوموں سے بات کرتے ہیں۔ ایک چھ فٹ چھ انچ کا نیگرو کہنے لگا "تم مزدوروں کو ان کا حق کیوں نہیں دیتے۔ اسے بتایا کہ کمپنی نے عدالت عالیہ سے حکم امتناعی لے رکھا ہے" تو وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

بولا "تم لوگ جج سے بات کیوں نہیں کرتے۔ ذرا سوچو اگر امریکہ نے امداد بند کر دی تو تمہارے پاس ججوں کو تنخواہ دینے کے لئے بھی رقم نہیں ہوگی۔"

"کیا تمہارا صدر سپریم کورٹ کو فرمان جاری کر سکتا ہے؟"

میں اپنا غصہ ضبط نہ کر سکا "یہاں عدالتیں آزاد ہیں۔ ہم ججوں کے اندر جھانک کر نہیں دیکھتے کہ کس نے کب اور کیا فیصلہ کرنا ہے۔" میٹنگ ایک تلخ نوٹ پر ختم ہو گئی۔ انہوں نے اپنی حکومت کو رپورٹ کر دی کہ پنجاب کا محکمہ محنت کمپنی سے ملا ہوا ہے اور غیر ضروری طور پر لیت و لعل سے کام لے رہا ہے۔ جب امریکن پریشر مزید بڑھا تو مرکزی حکومت کا حکم آ گیا کہ ہر صورت میں حکم امتناعی ختم کرایا جائے۔

میں نے اس سلسلے میں ایک میٹنگ بلائی۔ یونین اور کمپنی کے نمائندوں کو بلا کر وجہ نزاع پوچھی۔ یونین کے عہدہ داروں کا موقف تھا کہ یہ لوگ پاکستان کو کوریا سمجھ بیٹھے ہیں۔ بڑی سختی کرتے ہیں۔ ناروا پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ کام کرتے ہوئے پانی پینے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ کسی نے رفع حاجت کے لئے جانا ہو تو اُنگلی چھوڑ پورا ہاتھ بھی لہراتا رہے تو ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ آپ ایک بار ہمیں انجمن سازی کی اجازت دیں اگر ناکوں چنے نہ چبوا دے تو نام بدل دینا۔ پراجیکٹ ڈائریکٹر مسٹر وانگ صرف ڈانگ کی زبان سمجھتا ہے۔

وانگ کہنے لگا ''ہم ان کو دگنی تنخواہ دیتے ہیں کام میں تساہل برداشت نہیں کر سکتے۔ یہی ہماری ترقی کا راز ہے۔ ہم نے سارے ترقی پذیر ممالک میں تعمیراتی منصوبے شروع کر رکھے ہیں جبھی تو امریکیوں کو پسینہ آ رہا ہے۔'' آخر میں اس نے ایک دلچسپ بات کی۔ کہنے لگا ''مسٹر شاہ! اِٹ از اے سٹرینج کنٹری۔ اِٹ از اے سٹرینج کنٹری! ٹو ڈیز لیو بی فور عید۔ ٹو ڈیز عید لیو۔ ٹو ڈیز آفٹر عید'' آپ ترقی کیسے کریں گے۔

It is a strange country. Two days leave before Eid. Two days Eid leave, "Two days afterwards.

وانگ نے درست کہا تھا۔ کورین نہایت محنتی ہیں، جانفشانی سے کام کرتے ہیں۔ چیونٹیوں کی طرح، پانی بھی اسی وقت پئیں گے جب پانی پینے کا وقفہ ہوگا۔ قصہ مختصر ہم نے امریکیوں کی ایک نہ چلنے دی۔ مرکزی حکومت کی بھی بات ان سنی کر دی۔ لکھ بھیجا کہ عدالتی کارروائی کے دوران کوئی قدم نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ منصوبہ قومی اہمیت کا تھا اسے بہر طور مکمل ہونا تھا۔ محکمہ ہائی وے بھی غش پہ غش کھا رہا تھا۔ اربوں روپے کی کمیشن ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اس کے اہلکار پروپیگنڈے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اُن دنوں ایک لطیفہ زبان زد خاص و عام تھا۔ میاں نواز شریف نے سیکرٹری ورکس سے پوچھا ''جی ٹی روڈ کس نے بنوائی تھی؟''

بولا ''شیر شاہ سوری نے!''

''اس کی لمبائی کتنی ہے؟''

''بہت طویل شاہراہ ہے۔ پشاور سے لے کر کلکتہ تک جاتی تھی۔''

''اچھا!'' میاں صاحب نے خوشگوار حیرت کا اظہار کیا۔

محکمہ نے جرمن گورنمنٹ کی امداد سے چند ٹیکنیکل پروجیکٹ شروع کر رکھے تھے۔ ووکیشنل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ جہاں پر طلبا اور طالبات کو تھیوری کے علاوہ عملی تربیت دی جاتی اور مشینوں پر کام کرایا جاتا۔ بڑے عرصے سے

محسوس کیا جا رہا تھا کہ لوگوں کی اکثریت وائٹ کالر جاب کی متلاشی ہوتی ہے جس سے ہنرمند دن بدن کم ہو رہے ہیں۔ نوکریاں آسانی سے نہیں ملتیں اور پھر تنخواہ بھی ایک ٹیکنیکل ہینڈ کے مقابلے میں قلیل ہوتی ہے۔

جرمن حکومت کی طرف سے پراجیکٹ ڈائریکٹر مقرر تھا۔ وہ مشرقی جرمنی سے آیا تھا۔ الحاق کے باوجود مکمل طور پر کمیونسٹ اثرات اور تعلیمات سے آزاد نہ ہو پایا تھا۔ جرمنوں نے تھائی لینڈ، سنگاپور اور ملائشیا میں بھی اسی قسم کے پراجیکٹ شروع کیے تھے جو بڑی کامیابی سے چل رہے تھے۔ اسی قسم کا تجربہ اب پاکستان میں کیا جا رہا تھا۔ جرمن حکومت کی خواہش پر پروگرام بنا کہ محکمے کے متعلقہ افسر وہاں جا کر ان منصوبوں کو دیکھیں تاکہ انہیں اندازہ ہو سکے کہ وہ ملک وقوم کے لئے کس قدر مفید ہیں۔

ملائیشیا، سنگاپور اور بنکاک کا دورہ: ہم نے پانچ افسروں کا وفد تیار کیا۔ سب سے پہلے ملائشیا گئے۔ شہر کو دیکھ کر یقین نہ آیا کہ یہ وہی کوالالمپور ہے جو میں نے ۸۴ء میں دیکھا تھا۔ شہر نے اپنی ہیئت بدل ڈالی تھی۔ پرانی شکستہ عمارتوں کی جگہ سکائی اسکریپر کھڑے ہو گئے تھے۔ پچاس منزلہ، سو منزلہ عمارتیں، لطف کی بات یہ تھی کہ مین ہیٹن اور ہانگ کانگ کی طرح ایک ہی طرح کے Glass boxes کھڑے نہیں کیے گئے تھے بلکہ ہر عمارت کا اپنا آرکیٹیکچرل ڈیزائن تھا جس میں اسلامک ٹچ صاف نظر آتا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی سڑکوں کی جگہ کنکریٹ روڈز نے لے لی تھی جن پر ڈرائیو کرتے ہوئے یوں گمان ہوتا جیسے رن وے پر موٹر چلا رہے ہوں، چار سو ہریالی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ہم طویل عرصہ تک لاہور کو شہر باغات سمجھتے رہے۔ کوالالمپور کے باغات، پارک، گالف کورسز دیکھ کر عقل دنگ رہ گئی۔ پہاڑیوں کو بھی پھولوں کی بیلوں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ شہر کے لغوی معنی ٹیلے دریا Muddy River کے ہیں۔ دریا بہہ رہا تھا لیکن مٹی غائب ہو گئی تھی۔

یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا۔ اس ملک کے نمائندے کسی زمانے میں پاکستان آ کر اس کی ترقی کے رازوں کا کھوج لگاتے تھے۔ صرف ایک شخص کی مساعی نے ساری قوم کو بیدار کر دیا انہیں ایک نئی ہمت اور حوصلہ دیا ایک انوکھی سمت عطا کی۔ وہ ملائشیا کا وزیراعظم مہاتیر محمد تھا۔ بیدار مغز، بلند حوصلہ، باریک بین، بین الاقوامی معیشت کے اسرار و رموز سمجھنے والا جو دشمنانِ اسلام کی ریشہ دوانیوں کا توڑ بھی جانتا تھا۔ مغرب کا تمام پروپیگنڈہ، حربے، چالیں، چالاکیاں بھی اس کے پائے استقامت کو متزلزل نہ کر سکیں۔ لگن، خلوص اور ایمان کامل کے ساتھ وہ زینہ بہ زینہ، مرحلہ بہ مرحلہ، قدم بہ

قدم ترقی کی منازل طے کرتا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سنگاپور اور ملائشیا کا الحاق ہوا لیکن جلد ہی دونوں ملک اس نتیجے پر پہنچے کہ الگ رہنے میں ہی فائدہ ہے۔ بغیر کسی تلخی، یا نزاع کے دونوں الگ ہو گئے۔

پہلا دن ہم نے Sight seeing میں گزارا کیونکہ اتوار تھا۔ ایمان کی حرارت والوں کی مسجد دیکھی۔ نمازی بھی کثیر تعداد میں تھے۔ ملک کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔ گو باقی مذاہب کے لوگ بھی بستے ہیں لیکن واضح اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ کسی قسم کی فرقہ واریت نہ ہے اس کی اجازت بھی نہیں ہے۔ سکھ، ہندو، عیسائی اور بدھ سب مذاہب کی عبادت گاہیں موجود ہیں۔ لوگ اپنے عقیدے کے مطابق وہاں جاتے ہیں۔ نہ کبھی اسلام خطرے میں پڑا ہے اور نہ اسلام کا خطرہ کسی دیگر مذہب نے محسوس کیا ہے۔

بادشاہ کا محل دیدنی ہے۔ کسی زمانے میں بادشاہت تھی اب آئین کی رو سے سلطان کے اختیارات محدود کر دیئے گئے ہیں۔ وہاں Constitutional Monarchy ہے۔ نو سلطان ہیں ہر خاندان پانچ سال کے لئے حکومت کرتا ہے۔ گویا چالیس برس بعد اس سلطان یا اس کے خاندان کی باری آتی ہے۔ جب گائیڈ ہمیں بتا رہا تھا کہ یہاں نو سلطان ہیں

تو نہ جانے کیسے میری نظروں کے سامنے زہرہ نگاہ کا ہیولیٰ اُبھرا جو اپنی منظوم نظم ''ایران اور پاکستان'' کا وہ حصہ دھیمے مگر صاف سروں میں گنگنا رہی تھیں۔

اگر ہے فرق جو کوئی تو بے ارادہ ہے
کہ میرے شاہوں کی تعداد کچھ زیادہ ہے

.....

میں اُس گائیڈ کو کیسے بتاتا کہ تم نو سلطانوں کا ذکر کر کے اترا رہی ہو۔ وطن عزیز میں نو سو سلطان ہیں۔ ہر قسم کے، حادثاتی سلطان، معجزاتی سلطان اور وارداتی سلطان۔

گنٹنگ ہائی لینڈ جانے سے پہلے ہم نے مشہور غار دیکھی۔ دنیا کی تمام غاریں زیر زمین ہیں۔ یہ پہاڑی کے اُوپر ہے۔ دو سو کے لگ بھگ سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ راستے میں ہنومان جی کے چیلے آپ کا سواگت کرتے ہیں۔ منہ چڑاتے ہیں، خوراک کا تقاضہ کرتے ہیں مانگنے کی عادت پڑ گئی ہے کیونکہ لوگ پھل فروش سے امرود، سیب، آلو، کچالو خرید کر میزبانوں کے لئے لے جاتے ہیں۔

غار کے اندر پہنچ کر کچھ عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ یہ ظور یڈا کی Caves of winds یا ہندوستان کی اجنتا اور ایلورا کی طرح نہیں ہیں۔ یوں پتہ چلتا ہے جیسے آدمی ایک وسیع و عریض ہال میں آ گیا ہو جس میں بے شمار شینڈلرز لٹک رہے ہوں۔ بارش کے پانی

نے صدیوں کی شکست و ریخت کے بعد کرسٹل کھڑے کر دئے ہیں۔ وہاں پہنچ کر گھٹن کا احساس نہیں ہوتا۔ ایک عجیب قسم کا Sense of Elevation ہوتا ہے۔

۸۴ء میں گنٹنگ ہائی لینڈ پوڈو کے اڈہ سے بس پر گیا تھا۔ آدھا بس اور اتنا ہی کیبل کار کا سفر تھا۔ اب کے ہمارے پاس نئی نویلی ٹیکسی تھی۔ سرکاری دوروں کا یہی فائدہ ہوتا ہے، بسوں میں دھکے نہیں کھانا پڑتے اور سرائے نما سستے ہوٹلوں کی تلاش میں جوتیاں نہیں چٹختیں۔ ہمیں چالیس منزلہ ہوٹل کنکارڈ میں ٹھہرایا گیا تھا۔ چوبیسویں منزل پر جب کھڑکی سے باہر دیکھتے تو آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتوں کے جھرمٹ میں کچھ یوں احساس ہوتا جیسے آپ کوتہہ خانے میں کمرہ ملا ہو۔

پہلی مرتبہ جب کیسینو گیا تو شہر اور کیسینو کے درمیان سرسبز پہاڑ اور وسیع و عریض جنگل تھا۔ اب پہاڑ پر جگہ جگہ ولاز بن گئے تھے۔ امیر لوگ جب دفتری ماحول سے اُکتاتے ہیں تو ان عشرت کدوں میں آ کر داد عیش دیتے ہیں۔ دولت جہاں عیش و عشرت کے اسباب مہیا کرتی ہے وہاں کچھ مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ صحافیوں اور بلیک میلروں کی پرانی عادت ہے کہ ان کا پیچھا کرتے ہیں اور انہیں مسلسل سونگھتے رہتے ہیں۔ شہر کی ہماہمی سے دُور کسی غیر علانیہ رہائش گاہ تک پہنچنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ نیویارک میں تو مسلسل حرکت میں رہتی ہوئی لیموزینوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ کیمرے کی آنکھ کے لئے خاصا مشکل ہوتا ہے کہ دبیز پردوں اور کالے شیشوں کو چیر کر اندر کا منظر دیکھ سکے۔

مسٹر لو نے گنٹنگ ہائی لینڈ کو بھی لاس ویگس کے ایم جی ایم گرینڈ کے Theme Park کی طرح خاصا ڈیولپ کر لیا ہے۔ جھیل، جھولے، رولر کوسٹر، ریستوران، بارز، تھیٹر، مساج پارلر میوزک، وہ لوگ جو کیسینو میں جا کر نہیں لٹتے، یہاں جیب ہلکی کروا لیتے ہیں۔ مقصد تو لو صاحب کی خدمت میں کچھ نہ کچھ پیش کرتا ہوتا ہے۔ ہم نے دن وہاں گزارا۔ کیسینو کا چکر تو لگایا لیکن کھیلنے سے اجتناب برتا۔ لذت گناہ اپنی جگہ لیکن مجبوری حالات بھی کوئی چیز ہے۔ جرمن حکومت نے ہمارے آرام کا تو خیال رکھا تھا لیکن تعیش کے لئے کچھ نہ دیا تھا۔ اگر کسی عرب حکومت کے مہمان ہوتے تو شاید اس مد میں بھی کچھ نہ کچھ رقم ضرور مختص کی جاتی۔

دوسرے دن انڈسٹریل زون کا دورہ تھا۔ وہاں پہنچ کر یوں گمان ہوا جیسے کوالالمپور کے باہر بھی ایک شہر آباد ہے۔ کوئی ایسی ملٹی نیشنل کمپنی نہ تھی جس نے اپنا کارخانہ قائم نہ کیا ہو۔ مہاتیر نے سب کو صلائے عام دے رکھی تھی۔ کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

[جاری ہے۔]

وہ اک شام جو ٹھہر گئی [طنز و مزاح]

کہا جاتا ہے کہ زندگی کے کچھ دن ایسے ہوتے ہیں کہ تمام عمر کے لیے ساکن ہو جاتے ہیں اور کچھ شامیں ٹھہر جاتیں ہیں۔ مگر مجھے یہ جملہ کبھی سمجھ نہ آیا کہ شام ٹھہر جانے کے کیا معنی۔ میں اکثر یہ بڑ ہانکا کرتا تھا کہ ''بھئی کوئی سر پھرا فلاسفر ہوگا جس نے یہ گپ اڑائی ہوگی''۔ پھر یوں ہوا کہ ایک شام آئی، آئی کیا ٹھہر گئی اور ریشے ریشے میں ہلکے نیلے سبز رنگ کی مانند سرایت کر گئی۔

یونی ورسٹی میں دوست کم، اور گداگر زیادہ ہوتے ہیں۔ گداگر سے آپ کوئی خراب معنی ذہن میں نہ لائیے گا، میری مراد ان لوگوں سے ہے جو ہر وقت نوٹس مانگنے کی سہی میں رہتے ہیں۔ مگر میرے تئیں معاملہ قدرے مختلف ہے۔ میرے دوست صرف دوست نہیں، بلکہ دوست کم اور نیم سر پھرے زیادہ ہیں۔ مگر میں انہیں سر پھرا کہنے سے گھبراتا ہوں۔ خدا معاف کرے وہ کوئی دہشت گرد قسم کے لوگ نہیں، جن سے ڈرا جائے۔ گھبراہٹ صرف اس بات کی ہے کہ کہیں وہ اپنی ایسی صفتی تعریف سن کر نیم پاگل نہ ہو جائیں اور مجھے اپنی خوبی کا نشانہ نہ بنا بیٹھیں۔ ہائے یہ میں کن باتوں میں الجھ گیا۔ میں تو آپ سے بات کچھ اور کرنے آیا تھا مگر معاملہ دوسری سمت کو چل نکلا۔ اس سے پہلے کہ یہ معاملہ قصہ میں تبدیل ہو، آپ کو، اندرون لاہور کی سیر کروائے دیتے ہیں۔

ایک صبح یونی ورسٹی گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دن بڑا نکھرا ہوا اور سورج بڑا شفاف نکلا ہے۔ اس پر ہلکی ہلکی ہوا، عطر بکھیرتی چار سو مہک رہی ہے۔ سوچا آج کہیں نکلا جائے۔ کوئی سفر کیا جائے تاکہ اتنے حسین دن کو ضائع کرنے اور دھندلا ہونے سے بچایا جا سکے۔

بات کرنے کی دیر تھی کہ چھ سات لونڈے لپاڑی جھٹ تیار ہوئے اور بات، اندرون لاہور دیکھنے کی ٹھہری۔ یہ قصہ موقوف کرتے ہوئے کہ یونی ورسٹی سے دہلی گیٹ تک کا سفر کیسے طے ہوا، آپ کو سیدھا دہلی گیٹ پر لیے چلتے ہیں۔ یہاں یہ عرض کرنا لازم ہے کہ اگر آپ اندرون لاہور کی تاریخ جاننا چاہتے ہیں تو اس تحریر کو یہی چھوڑ دیں اور کوئی ڈھنگ کا کام کریں۔ میں نہ ہی تاریخ دان ہوں اور نہ ہی مورخ۔ میں تو ادھر

علی حسن اویس

ادھر کی ہانک کر کہیں کھو جاؤں گا اور آپ کفِ افسوس ملتے رہ جائیں گے۔

ہاں تو پھر ہم دہلی گیٹ سے شاہی حمام پہنچے اور وہاں سے اس گلی کی نکڑ تک بھاگے بھاگے گئے جس کے متعلق مشتاق احمد یوسفی نے کہا تھا کہ ''لاہور کی بعض گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ اگر ایک طرف سے عورت آ رہی ہو اور دوسری طرف سے مرد تو درمیان میں صرف نکاح کی گنجائش بچتی ہے۔'' یعنی ہمارا منشا بھی یہی تھا کہ سامنے سے ایک دوشیزہ آ رہی ہو اور ادھر سے ہم گلی میں پھیلے چل رہے ہوں۔ یہ خواہش پوری تو نہ ہوئی مگر ہوا یہ کہ آگے سے ایک پچاس سال سے کچھ پرے کی آنٹی نے داخل ہو کر مشتاق احمد یوسفی کے جملے کا رمز ہم پر ضرور کھول دیا۔ شاید کچھ اور بھی کھل جاتا مگر اس مقام کے آنے سے پہلے وہ آنٹی ایک گھر میں داخل ہو چکی تھی۔

کچھ لمحے بعد ہم نے خود کو عثمان کی بیٹھک میں پایا۔ بیٹھک کا دروازہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ ہم سینہ تان کر داخل ہوتے، اور نہ ہی اتنا چھوٹا کہ پہلے ٹانگیں اندر لے جانا پڑتیں اور پھر باقی دھڑ اندر جاتا۔ درمیان کی کوئی کیفیت تھی، اس لیے سر جھکانے کو ترجیح دی۔

ہم عثمان کو مغل دربار کا وزیر خاص سمجھ رہے تھے کہ اس کی بڑی قدر و منزلت رہی ہو گی، دروازے پر ہاتھی جھولتے ہوں گے جو اس کی بیٹھک اتنی مشہور ہے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ عثمان زندہ ہے بلکہ اچھا خاصہ زندہ ہے تو ہاسا پڑ گیا۔

وہاں سے نکلے تو شاہی قلعہ جا دھمکے۔ ہوا ہمارے ساتھ تھی اور دن کی دوشیزگی پہلے سے کہیں زیادہ نکھر گئی تھی۔ شاہی قلعہ کیا ہے، اس کا جواب مجھ سے بہتر گوگل پر سے مل جائے گا۔ باقی وہاں کچھ زیرِ زمین سرنگیں ہیں ہمارا ایک دوست جو پٹھان ہے بلکہ اب تو اسے پنجابی کہنا چاہیے۔ اس کا ثبوت وہ پنجابی گالیاں بلکہ غلیظ مہذب گالیاں ہیں جو اسے سمجھ آ جاتی ہیں۔ بہرحال وہ دوست ان سرنگوں میں گھس گیا اور ہمیں للکارا۔ ہم اپنا ہوش بھول، اس طرف کو دوڑے جہاں سے آواز برآمد ہوئی تھی۔ آگر آپ یہ سمجھے ہیں کہ خود کو بھول کر آواز کی سمت بھاگنے کے پیچھے یہ رمز ہے کہ کہیں دوست مصیبت میں نہ ہو، تو آپ غلط سمجھے ہیں۔ ہم تو اس وجہ سے بھاگے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے کسی حسینہ کی روح نے دبوچ لیا ہو اور ہم اس لذت سے محروم رہ جائیں۔ خیر وہاں سے جیسے تیسے نکلے وہ یا تو خدا جانتا ہے یا وہ لوگ جو شریف نہیں ہوتے۔ اصل دورنگی تو شاہی مسجد میں دیکھی۔ ایک تو رب کا گھر، اوپر سے اس کی پاکیزگی کی چمک، تیسرا ہم زمانے سے اکتائے

ہوئے، اندر داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی نوادرات کی زیارت کرنے کے لیے بلا رہا ہے بلکہ چلا رہا ہے کہ ''تھوڑا وقت باقی ہے بس پھر آپ اس لمحہ سے محروم ہو جائیں گے''

ہم دوڑے دوڑے سڑھیاں چڑھنے لگے تاکہ نوادرات کی زیارت سے کہیں محروم نہ ہو جائیں۔ جب تمام نوادرات کی زیارت کر چکے تو آخری زیارت اس گلک کی کروائی گئی جس پر لکھا تھا ''پیسہ ہاتھ کی میل ہے، یہاں میل اتار کر ہاتھ صاف کریں۔''

تھوڑے بہت ہاتھ صاف کرنے کے بعد جب ہم دوبارہ صحن میں آئے تو ایک بورڈ پر نظر پڑی، لکھا تھا ''زیارت کے اوقات صبح آٹھ سے اذانِ مغرب تک''۔ ہم چونک اٹھے، سمجھ آیا کہ لمحہ سے محرومی کا اصل مطلب وائلٹ میں موجود پیسہ سے محرومی تھی تو ہم دنیا بھول کر رب سے کہنے لگے یا خدا ''انہیں اٹھا''۔

شام ڈھلنے لگی، چاند ابھرنے لگا اور ہوا میں قدرے سختی اتر آئی تو ہم حویلی سے کھانا کھانے پہنچے۔ وہاں کا کھانا کیا ہی لزیز تھا کا ثبوت وہ بل ہے جو آپ سے شیئر نہیں کیا جا سکتا۔ مگر وہاں موجود ایک گلوکار نے ہماری فرمائش پر غلام علی خاں کی گائی ہوئی غزل:

ہم تیرے شہر میں آئے ہیں مسافر کی طرح
صرف ایک بار ملاقات کا موقع دے دے

.....

ایسی گائی کہ ہوا ٹھہر گئی، تارے جھک گئے اور چاند حویلی پر اتر آیا۔

شاید آپ جانتے ہوں مگر پھر بھی آپ سے شیئر کیے دیتا ہوں کہ اگر آپ نے کسی کے ذوق کا اندازہ لگانا ہو تو یہ دیکھو کہ کیا وہ چائے پیتا ہے۔ اگر جواب ہاں میں آئے تو شاید وہ بندہ باذوق ہو سکتا ہے۔ ہم بھی اسی کیٹیگری والے لوگ ہیں، اور چائے کا ذوق رکھتے ہیں۔ لہٰذا کھانے کے بعد کسی دوسرے ہوٹل سے چائے پینے کی ٹھانی۔ وہاں پہنچے اور براجمان ہوتے ہی شعر و شاعری کی محفل جما بیٹھے۔ چائے نوش کیے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ شعروں کا لطف لیے جاتے تھے۔ ایک دوست نے کسی شاعر کا یہ شعر پڑھا:

کیا کیا منظر دیکھے میں نے کیسی جگہوں میں گھوما
کن لوگوں میں بیٹھا یہ منظر بھی یاد آئے گا

.....

سب دوست پھڑک اٹھے کہ کیا ہی شام کی مناسبت سے شعر ہے، مگر اس چہک اور ہنسی کے پیچھے آنسو جھلملا رہے تھے کہ آج کی شام ڈھل نہ جائے کہیں۔ وقت گزر گیا اور ایک نیا دن نئی روشنی لے آیا مگر وہ شام ہمارے اندر کہیں ٹھہر گئی۔

☆☆☆☆☆

چیستانِ رباعی

اصنافِ سخن میں رباعی وہ واحد صنفِ سخن ہے جو گزشتہ آٹھ سو سال سے بحث وتمحیث کا موضوع چلی آرہی ہے۔ یہ کئی ناموں ترانہ، چہاربیتی، دوبیتی، جفتی، چہار مصراعی سے موسوم ہے۔ اس کا درست اور قدیمی نام کونسا ہے۔ آیا یہ اسلامی دور کی صنف ہے یا قبل از اسلام کی۔ اس کا مخترع کوئی فردِ واحد ہے یا عام عوام کے گیتوں سے متشکل اور مرتقی ہوئی ہے۔ ہر سوال کا ہر کسی نے اپنا اپنا جواب دیا ہے۔ یہ سارے سوالات اور ان کے جوابات اہلِ ایران کے اُٹھائے ہوئے اور تجویز کیے ہوئے ہیں۔ ابتدا محمد بن شمس قیس رازی (۶۲۷ھ میں زندہ) نے کی بعد میں ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت۔ اَلمُعجم فی معاییر اشعار العجم میں لکھا:

''متقدمین شعرائے عجم میں سے ایک میرے گمان میں رودکی نے، واللہ اعلم ایک لڑکا دیکھا گیارہ سالہ جس کے عارض و زلف یوں تھے، جیسے سمن گرد لالہ منظر دلکشا تھا اور صبح جانفزا۔ گفتار ملیح تھی اور زبان فصیح۔ اخروٹ پھینکتے وقت یکا یک سارے اخروٹ گو سے باہر جا پڑے اور ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے گو کی جانب بڑھنے لگا۔ لڑکا بولا:

غلطاں غلطاں ہمی رود تا سرِ گو
یا تابُنِ گو

رودکی کو یہ کلمات وزن مقبول اور نظم مطبوع محسوس ہوئے۔ قوانین عروض کی طرف مراجعت کی اور اس وزن کو متفرعات ہزج سے تخریج کیا اور اس بنا پر کہ لڑکا خوب و موزوں و دلبر و جوان و سخت تازہ روتھا، اس کا نام ترانہ رکھ دیا رودکی نے اس پر تین مصرعے اور لگا کر رباعی کر دی۔''

اپنے اس بیان میں جو سراسر انشا پردازی ہے شمس قیس رازی نے تلبیس سے کام لیا ہے۔ ''متقدمین شعرائے عجم''، ''میرے گمان میں''، ''واللہ اعلم'' کہہ کر ذمہ داری

محمد ارشاد

قبول کرنے سے بچ بھی رہا ہے اور یہ ترغیب بھی دے رہا ہے کہ رباعی اہل عجم کی اختراع ہے اور ہزج سے علاقہ رکھتی ہے اور اس کے اوزان ہزج کے متفرعات ہیں۔ چونکہ لڑکا گیارہ سالہ ہے، کھیل کود کے دن ہیں، نابالغ ہے، شاعر نہیں ہوسکتا اس لیے اس کے بول طبع عجم سے ابھرے ہیں۔ لیکن دروغ گو را حافظہ نباشد۔ اسی سانس میں ''لڑکا خوب وموزوں ودلبر وجوان وتخت تازہ رو تھا، اس کا نام ترانہ رکھ دیا۔'' پہلے گیارہ سالہ نابالغ بچہ پھر دلبر و جوان و تخت تازہ رو اور تازہ روئی کی بنا پر ترانہ (تر و تازہ سے ترانہ) نام۔ ''آں را ترانہ نام نہاد و مایۂ فتنۂ بزرگ را، سر بجہاں در داد۔'' یہاں دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ رودکی فارسی کا پہلا شاعر مانا جاتا ہے اور یہ کہ وہ گانے بجانے کا بھی ماہر تھا لیکن وزن ہزج (عربی بحر سے تخریج اور ترانہ نام؟ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

۱۔ ھَزِجَ۔ مصدر۔ ھزجا۔ المغنی فی غنائہٖ ___ گویے کا سر اور راگ سے گانا اور پڑھنا

۲۔ الھزج ___ ایک سر والا ترانہ۔ گیت

۳۔ الھزج ___ ترانہ گانے والا

۴۔ الاھزوجۃ ___ ترنم والا گیت

(المنجد۔ دارالاشاعت، کراچی)

ہزج سے مراد گیت ہے چونکہ عربوں کے گیت اسی بحر میں ہوتے تھے اور ہیں۔ اسی لیے رباعی کا نام ترانہ رکھا گیا جو خالص فارسی کا لفظ ہے اور وجہ دلبر و جوان کی سخت تازہ روئی بتائی جا رہی ہے۔

۱۔ ترانہ۔ قطعہ کوتاہے برائے خواندہ شدن ہمراہ سازہائے موسیقی یا بصورت آہنگیں۔

۲۔ آواز و نغمہ

۳۔ ترانہ ساز ___ سازندۂ ترانہ بویژہ آہنگ آں

۴۔ ترانہ سرا ___ سرایندۂ ترانہ بویژہ شعر آں

۵۔ ترانہ خواں ___ خوانندہ، آواز خواں ___

(فرہنگ فارسی۔ موسسہ نشر کلمہ۔ تہران)

پس ہزج اور ترانہ ہم معنی الفاظ ہیں۔ ترانہ ترجمہ ہے ہزج کا۔ شمس قیس رازی نے جس لڑکے کا ذکر کیا دولت شاہ سمرقندی نے اس کے باپ کا نام بھی بتا دیا (تذکرۃ شعراء۔ ۸۹۲ھ)۔ یہ لڑکا یعقوب بن لیث صفاری (م ۲۶۳ھ) کا بیٹا تھا۔

اخروٹ کھیلتے وقت لڑکے کی زبان سے یہی مصرع سن کر شعرائے دربار ابودلف عجلی اور ابن الکعب سے بحر دریافت کی۔ انھوں نے تحقیق کرکے بتایا کہ یہ ہزج کی ایک قسم ہے اور تین مصرع اور لگا کر رباعی پوری کر دی اور اس کا نام دوبیتی رکھا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ خواجہ نصیرالدین طوسی سے منسوب معیار الاشعار کے مصنف نے یہ انکشاف کیا کہ رباعی کا ابتدائی نام چہار بیتی تھا جو قبل از اسلام

سے چلی آ رہی ہے۔ اس کے اوزان بھی ہزرج کے متفرعات نہیں ایران زا اور مقامی ہیں۔ دوبیتی چہار بیتی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ (حافظ محمود شیرانی)

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

جو بھی آیا ٹیڑھی دیوار پر مزید کچھ روڑے رکھ گیا۔ بنیادِ ظلم در جہاں اندک بود ہر کہ آمد براں مزید کرد (سعدی)۔ ترانہ کی وجہ تسمیہ تو ہم جان ہی چکے ہیں لیکن ''وہ صنف خاص جسے ہم رباعی کہنے کے عادی اور اس کے اوزان بھی ہزج (عربی بحر) سے مستخرج نہیں'' تو خالص فارسی اوزان کیا ہیں بحالیکہ یہ قدیم الایام (قبل از اسلام) کی صنفِ سخن ہے۔ اور اس کا نام کیا ہے۔ پروفیسر شیرانی چونکہ معیار الاشعار کو محقق طوسی کی تالیف باور کرتے تھے، جس میں رباعی کو چہار بیتی کہا گیا ہے۔ صفاری دور کے ابوشکور بلخی کی اس رباعی کو چہار بیتی کے قدیم ترین نمونے کے طور پر پیش کیا۔ ''چہار بیتی کا سب سے قدیم نمونہ مجھ کو ابو شکور بلخی کے ہاں ملتا ہے:

اے گشتہ من از غمِ فراوانِ تو پست
شد قامتِ من ز دردِ ہجرانِ تو شست
اے شستہ من از فریب و دستان تو دست
خود ہیچ کسے بسیرت و شان تو ہست

جسے اگر چہار بیتی کی شکل میں لکھا جائے تو صورت حسب ذیل ہوگی:

اے گشتہ من از غمِ
فراوانِ تو پست
شد قامتِ من ز دردِ
ہجرانِ تو شست
اے شستہ من از فرے
ب و دستان تو دست
خود ہیچ کسے بسی
رت و شان تو ہست

اس رباعی کو آٹھ ٹکڑوں میں لکھ کر پروفیسر شیرانی یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ رباعی معقد تھی۔ ''معقد اشعار عربی کی تقلید میں فارسی میں بھی رائج تھے۔ زیادہ تر انہی ایام میں جب شعر گوئی کا مدار مربعات پر تھا۔ اشعار معقد میں مصرع اول مصرع دوم سے لفظاً اور معناً وابستہ ہوتا ہے جب تک دوسرا مصرع ساتھ ملا کر نہ پڑھا جائے بات ناتمام رہتی ہے۔ اس لیے کئی موقعوں پر ضروری ہے کہ دونوں مصرعوں کو ملا کر مثل ایک مصرع مثمن کے پڑھیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار معقد ہیں جو فارسی میں اصول مثمنات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ جب مثمنات کی دریافت نے فارسی عروض میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا اوزان مربع کا رواج متروک ہو گیا اس ساتھ ہی اشعار معقد بھی جو مثنیٰ، مثلث مربع

ہوتے تھے غائب ہو گئے۔ محقق طوسی نے بعض مثالیں اپنی تالیف میں محفوظ کر رکھی ہیں۔ بعض یہاں درج کی جاتی ہیں:

بیار آں مے کہ پنداری
رواں یاقوت نابستے
ویا چوں برکشیدہ تیغ
پیش آفتا بستے"

وزن کی رو سے تیغ کی غ دوسرے مصرعے میں شامل ہے۔" وزن ہے مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن چار بار۔ "رودکی کا یہ قطعہ بالعموم مثمن شکل میں لکھا جاتا ہے حتیٰ کہ حدائق السحر میں بھی اس کو مثمن ہی درج کیا گیا ہے لیکن محقق طوسی نے مذکورہ بالا شعر مربع مثال میں درج کیے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قطعہ اصل میں مربع تھا اور رواج کے بعد اس کو بھی مثمن بنا لیا گیا۔"

پروفیسر شیرانی کا مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ رباعی ابتدا میں "مربع میں لکھی گئی چونکہ اس میں چار شعر ہوا کرتے تھے اس بنا پر اس کا نام چہار بیتی تھا ایک عرصہ دراز کے بعد جب اصول مثمنات کی دریافت نے اہل ایران کو زیادہ خوش آیند اور شگفتہ اوزان سے آشنا کر دیا مربعات ترک کر دیے گئے اور ترانہ جو چار بیت مربع پر شامل تھا دو بیت مثمن کے قالب میں ڈھل گیا اور دو بیتی کہلایا۔"

اگر ہم پروفیسر شیرانی کی توجیہات قبول کر لیں تو ماننا پڑے گا کہ مثمنات کی دریافت کا انقلاب عظیم رودکی کے بعد کا واقعہ ہے کیونکہ رودکی کا "یہ قطعہ اصل میں مربع تھا۔"

پروفیسر شیرانی کے اس بیان میں کئی باتیں غور طلب ہیں۔ "معقد اشعار عربی کی تقلید میں فارسی میں رائج تھے۔" "جو فارسی میں اصول مثمنات کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں جب مثمنات کی دریافت نے فارسی عروض" (؟) "میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا، اوزان مربع کا رواج متروک ہو گیا۔" چہار بیتی ان کے دعوے کے مطابق قبل از ظہور السلام کی صنف خالص ایران اور معقد عربی کی تقلید میں اور مثمنات کی دریافت سے فارسی عروض میں انقلاب عظیم اور مربع اوزان متروک اور رودکی کا قطعہ (ہزج مثمن سالم) صاحب معیار الاشعار کے مربع صورت میں لکھ دینے سے پروفیسر شیرانی کا موقف ثابت؟ عجیب استدلال ہے جب کہ یہ قطعہ ہزج مثمن سالم میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ ہم کیسے یہ مان لیں کہ رودکی نے اسے مثمن نہیں مربع صورت میں لکھا۔

بے شک عربی میں معقد اشعار موجود ہیں ہر بحر میں۔ عہد جاہلیت کے شاعر الفند الزمانی کے یہ اشعار جو ہزج مربع سالم میں ابو تمام کے حماسہ سے بطور مثال نقل ہیں:

صفحنا عن بنی ذُھلٍ
وَقُلنا القومُ إخوانٌ

ہم بنی ذُہل کو معاف کرتے رہے اور کہا کہ یہ لوگ ہمارے بھائی ہیں:

عَسَی الایامُ اَن یُرجعن قوماً کَالَّذِی کانوا

قریب ہے زمانہ ان کو ویسا کردے جیسے وہ پہلے تھے

فَلَمّا صَرَّحَ الشَرُّ

وَامسیٰ وَھُوَ عُریان'

پس جب اُن کا شر کھل کر سامنے گیا:

وَلَم یُبق سِوَی العُدوانِ دِنّاھُم کما دانوا

اور سوائے تعدی کے کچھ نہ بچا تو ہم نے بھی وہی کیا جو انھوں نے کیا۔

پہلا اور تیسرا شعر غیر معقد اور دوسرا اور چوتھا شعر معقد ہیں۔ معقد اشعار مثل ایک مصرع مثمن کے لکھے بھی اور پڑھے بھی جاتے ہیں۔ مثمنات کے دریافت کیا صاحب معیار الاشعار کا کارنامہ ہے۔

یزید کا شعر ہے:

اَنَا المَسمُومُ ماعندی بِتریاقٍ وَلا راقٍ

اَدِر کاساً وَناوِلھا الا یاایُّھا الساقی

جو ہزج مثمن سالم میں ہے اور رودکی کا قطعہ بھی، پھر 'مثمنات کی دریافت نے فارسی عروض میں انقلاب عظیم' کیسے پیدا کردیا؟ جواب طلب سوال ہے۔ فارسی زبان میں شاعری ان عربوں نے شروع کی جو ایران میں آن بسے تھے اور فارسی زبان سیکھ لی تھی چونکہ عربی بحور واوزان سے ہی آگاہ تھے اس لیے انہی بحور واوزان کو شاعری میں اختیار کیا۔ اگر فارسی بحور و اوزان ہوتے تو انھیں اختیار کرتے پہلوی نتیجتاً فارسی آپس میں بہنیں ہیں۔ فارسی کا شب پشتو کا شپہ فارسی کا شبِ تار پشتو کا تورہ شپہ، فارسی کا روز پشتو کا ورز اور روژ، فارسی کا راست (سچ) پشتو کا رشتیا، فارسی کا اَم (ہوں) پشتو کا یَم کتنے ہی اسما اور افعال ایک Root سے ہیں۔

منم کردہ ام رستم پہلواں
وگرنہ یلے بود درسیستاں
(فردوسی)

* خوشحالہ و دولت م غلامان دي
زہ رحمان بہ پشتو ژبہ عالمگیر یم
(رحمان بابا)

(خوشحال خٹک اور دولت کے سے (شاعر) میرے غلام ہیں میں رحمان پشتو زبان کا حکمران (اورنگزیب) ہوں۔

آہنگ اور لحونات کو ایک جاہل اور ان پڑھ پشتون بھی سمجھتا ہے اور معمولی سی گڑبڑ کو محسوس کرلیتا ہے اسے عروض کی طرف مراجعت کی ضرورت نہیں پڑتی کہ عروض اس کی اپنی طبع اور مزاج ہیں۔ وہ خود معیار عروض ہے۔ کون

---

* خوشحال خان خٹک کو خوشحالہ کہنا تحقیراً ہے۔ اس کی ذمہ داری خود خوشحال خان پر عائد ہوتی ہے جس نے کہا تھا:

جنگ پہ لرگی نشی   خٹک پہ سڑی نشی   جنگ لکڑی نہیں بن سکتی اور خٹک بندہ نہیں بن سکتا۔

ہے جس نے یہ لوگ گیت نہ سنا ہو۔

جانان مِ تلے دے
مالیدَ لے دے
دُغرِ ولمو کنِن کرکنڑی ٹولوی نا کنہ

(میرا محبوب جا چکا ہے۔ میں نے جاتے دیکھا ہے۔ پہاڑی کے دامن میں جھڑ بیری کے بیر اکٹھے کرنے کو)

یہی حال پنجابی شاعری کا ہے۔ پروفیسر علی عباس جلالپوری کی مقامات وارث شاہ سے:

بچہ کھا چُوری چو مجھ مُوری جیو وچ نہ ہو دلگیر میاں
رب کاج سواری آپ تیرے ہوئی تدھ دی نیک تقدیر میاں

....

آہنگ و لحونات میں معمولی سی گڑ بڑ کو ایک جاہل اور ان پڑھ پنجابی محسوس کر سکتا ہے اسے عروض جاننے کی ضرورت نہیں کہ پنجابی شاعری کے عروض اس کی طبع اور مزاج ہیں۔

دنیا میں اس وقت کم و بیش چھ ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہر زبان میں شاعری موجود ہے اور اپنا نظام عروض (Prosody) بھی۔ انگریزی اور جرمن عروض کی بنیاد Accent پر ہونے کی وجہ سے ان کا نظام عروض Accentual ہے۔ فرانسیسی، اطالوی اور اسپانوی کے اوزان عددی Numerical ہیں۔ عربی، سنسکرت، قدیم یونانی، قدیم لاطینی کا نظام عروض کمی یا مقداری Quantitative ہے۔ چونکہ فارسی اور اردو شاعری بھی عربی بحور و اوزان کے مطابق کی جاتی ہے اسی قبیل سے ہے۔ چینی اور ویتنامی شاعری کا نظام عروض نواختی Tonal ہے یعنی Tone پر مبنی ہے۔

اہل عرب ایرانیوں کو عجمی یعنی گونگے کہتے تھے اس لیے کہ وہ شاعری سے بے بہرہ تھے۔ ظہور اسلام کے وقت دو سپر پاورز پرشین ایمپائر اور رومن ایمپائر تھیں۔ رومیوں کے ورجل اور ہوریس (Horace) کی شاعری اب بھی دستیاب ہے۔ اسی طرح یونان کے ہومر اور سیفو کی بھی۔ نہیں تو ایرانیوں کی نہیں۔ اگر ایرانیوں میں شاعری ہوتی تو اپنا نظام عروض بھی ہوتا اور فردوسی کو بحر متقارب مثمن محذوف:

بنام خداوند جان و خرد
کزیں برتر اندیشہ برنگزرد

اور متقارب مثمن مقصور:

زشیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسید ست کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

....

میں شاعری نہ کرنی پڑتی۔ خالص ایرانی بحور و اوزان استعمال کیے جاتے۔ عربی الفاظ سے حتی الوسع اجتناب ممکن تھا تو عربی

بحر متقارب سے اجتناب کیوں نہیں تھا۔ اس کے باوصف دعویٰ یہ کیا جا رہا ہے کہ ''چہار بیتی کے اوزان عربی سے مستخرج نہیں بلکہ ایران زاد اور مقامی ہیں اور قدیم الایام سے یعنی قبل از اسلام سے یہ صنف چلی آ رہی ہے۔ ہر مصنف یہی راگ الاپ رہا ہے کہ رباعی فارسی الاصل ہے۔

(i) بدانکہ وزن رباعی کہ آں را ترانہ و دوبیتی نیز گویند آں را عجم پیدا کردہ اند و بر بست و چہار نوع آوردہ۔ عروض سیفی ۸۹۶ھ۔ (ii) باید دانست کہ وزن دوبیتی را کہ رباعی ترانہ نیز گویند آں را شعرائے عجم از وزن اخرم و اخرب مثمن اختراع نمودہ اند (تنقید الدرد قضائی ۹۹۹ھ) (iii) باید دانست کہ رباعی را شعرائے عجم اختراع نمودہ اند واں را ترانہ و دوبیتی نیز نامند۔ (iv) وزن ترانہ کے مخترع شعرائے عجم ہیں (قواعد العروض بلگرامی) - (v) رباعی از مخترعات اہل عجم است و بہ بحر ہزج اختصاص دارد (شجرۃ العروض۔ مظفر علی اسیر) (vi) جان لو رباعی نکالی ہوئی فصحائے عجم کی ہے اور ہزج سے خصوصیت رکھتی ہے (تقویت الشعرا۔ طالب)۔ یہ سارے اقتباسات پروفیسر شیرانی کے پیش کردہ ہیں۔ کیا دس جھوٹ یکجا ہو کر سچ بن جاتے ہیں۔ صف خالص عجمی اور ہزج عربی بحر سے اختراع؟ کیا کوئی دعویٰ اپنی دلیل آپ ہی ہوتا ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ ''رباعی خالص ترین نوع شعر ایرانی است۔ ہمہ متفق القول ہستند کہ اولاً وزن ترانہ یا رباعی ویژۂ ایرانیاں است و تازیاں ایں وزن از ما گرفتہ اند (احمد شہ وری) یعنی رباعی خال ترین نوع شعر ایرانی ہے۔ سبھی اس قول پر متفق ہیں کہ وزن ترانہ یا رباعی ویژۂ ایرانیاں ہے اور عربوں نے یہ وزن ہم سے لیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ اقرار وزنش بر لاحول ولاقوۃ الا باللہ باشد اگر بریں وزن نباشد آں را رباعی نہ گویند۔ کیا لاحول ولاقوۃ الا باللہ کسی عربی دان ایرانی شاعر کا یا کسی عرب شاعر کا مصرع ہے یا حدیث قدسی کے الفاظ ہیں۔ بہت بڑا اور فیصلہ کن سوال ہے رباعی کے جو اوزان حسن قطان (م ۵۴۸ھ) نے تخریج کر رکھے ہیں اگرچہ ناقص ہیں کہ ان میں قواعد عروض کی رو سے زحاف فع آ ہی نہیں سکتا زبردستی گھسیڑا گیا ہے لیکن یہ خلاف قاعدہ زحاف عربی شعر میں نہ پا کر اسے بھی رباعی کے ایرانی ہونے کی دلیل سمجھا گیا۔ زحافے کی دریں وزن مستعمل است در اشعار عرب نبودہ در قدیم بریں وزن شعر تازی نگفتہ اند۔ اس سے خود بخود یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ یہ وزن ایرانیوں کی دین ہے۔ انہی کے وضع کردہ اوزان کے مطابق:

سُبحٰنک لا علم لنا الاّ ما (سورۂ بقرہ ۳۲)

مفعول مفاعیل مفاعیلن فع

(اخرب)

فی الارضِ مرا غماً کثیراً وّسعۃً (النساء ۱۰۰)

مفعول مفاعلن مفاعلن فع

(اخرب)

قالوا ھٰذا الّذی رُزِقنا مِنۡ قَبلُ (بقرہ ۲۵)

مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

(اخرم)

قُلۡ اِنَّ الۡاَمۡرَ کُلَّہٗ لِلّٰہ (آل عمران ۱۵۴)

مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

(اخرم)

فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخر (شعراء ۲۱۳)

مفعول مفاعیل مفاعیلن فع

(اخرب)

کم وبیش بیس آیات اوزان کے ٹکڑے حسن قطان کے تخریج کردہ اوزان کے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ جآء الحق وَزَھق الباطل اِنَّ الۡبَاطِلَ کان زَھُوۡقاً۔ حق کے آتے ہی باطل نیست ونابود ہوا بے شک باطل کو نیست ونابود ہونا ہی ہوتا ہے۔ مسلسل آٹھ سو سال سے پڑنے والی ڈھونگوں اور ڈھکوسلوں کی گرد چھٹ جاتی ہے۔

پس رباعی کے اوزان ایرانی نہیں ربانی ہیں۔ زمینی نہیں آسمانی ہیں۔ لاشرقیہ و لاغربیہ۔ رباعی عربی میں بھی موجود ہے بہت پہلے سے۔ ایرانیوں نے جب عربی رباعیات کو حسن قطان کے تخریج کردہ اوزان کے مطابق پایا تو اس گمان میں پڑ گئے کہ وزن ترانہ یا رباعی ویژۂ ایرانیاں است وتازیاں ایں وزن از ما گرفتہ اند۔ عربوں کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں کہ رباعی کا وزن اصلی بقول پرویز خاطری

مفعول مفاعلن مفاعیلن فع

ہے اور یہ وزن عربوں نے ایرانیوں سے لیا ہے۔ ایرانیوں کو معلوم نہیں کہ عرب اپنی رباعیات کا وزن اصلی

فعلن متفاعلن فعولن فعلن

ٹھہراتے ہیں اور آخری رکن فعلن کو فِعلان، فُعِلُن، فُعِلان کرکے ایرانیوں کے جملہ چوبیس اوزان کو شامل کرلیتے ہیں۔

ایرانیوں کا ''وزن اصلی''

مف عو ل مفاعلن مفاعی لن فع

فعلن متفاعلن فعولن فعلن

....

عربوں کے وزن اصلی پر تقطیع ہوجاتا ہے اور اس وزن کا بحر ہزج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اسے بحر سلسلہ کہتے ہیں (المحیط الدائرہ)۔ نہ اخرب کا چکر ہے نہ اخرم کا۔ عربی میں چار چار مصرعوں پر مبنی چار مصراعیاں اس وقت سے کہی جاتی چلی آرہی ہیں جب فارسی شاعری کتم عدم میں تھی۔

یا لیتنی کُنۡتُ لَہٗ صلیباً

اکُونُ مِنۡہُ ابداً قریباً

ابصر حُسناً واشمُّ طیبا
لا واشیاً احشیٰ ولا رقیبا

اے کاش میں اس کے گلے میں لٹکتی صلیب ہوتا اور ہمیشہ اس کی قربت میں رہتا اور اس کے حسن کا نظارہ کرتا نہ کسی چغل خور کا ڈر ہوتا نہ کسی نگرانی کرنے والے کا۔ اسی وزن میں پچاس مزدوجات (جفتیاں) یاقوت رومی نے معجم الادبا میں مدرک بن علی شیبانی کی درج کی ہیں جس کے حلقۂ درس میں ایک وجیہہ و شکیل نصرانی لڑکا بھی بیٹھتا تھا۔ مدرک اسے دل دے بیٹھا۔ بدنامی کے ڈر سے عمرو بن یوحنا نے آنا چھوڑ دیا اور مدرک بن علی کو ہمیشہ کے لیے روگ لگ گیا۔ مرض عشق مرض الموت ثابت ہوا۔ مدرک بن علی کے دوست احباب اسے نزع کی حالت میں دیکھ کر عمرو بن یوحنا کو منت سماجت کر کے لے آئے۔ محبوب پر نظر پڑتے ہی مدرک کے حلق سے چیخ نکلی اور اس کے ساتھ ہی جان بھی نکل گئی۔

اس طرح کی چار مصراعیاں مختلف اوزان میں اس وقت سے کہی جاتی چلی آ رہی تھیں جب ایرانیوں نے شعر گوئی شروع بھی نہیں کی تھی۔ انہی اوزان مختلفہ میں لاحول ولاقوۃ الا باللہ بھی شامل ہو گیا جو سب سے زیادہ خوش آیند ثابت ہوا اور اس وزن پر کثرت سے کہی جانے والی چار مصراعیوں نے اسے رباعی کا خاص وزن بنا دیا۔

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستان کے لیے

.....

دکتور شوقی ضیف اپنی تاریخ الادب العربی میں لکھتے ہیں: **لم یکن شعر العصرین العباسی الاول والثانی یخصون الرباعیه بوزن معین بل کانو ینظمو نها فی جمیع الاوزان الشعر** یعنی عصر عباسی اول و ثانی میں رباعیاں کسی معین وزن میں نہیں کہی جاتی تھیں بلکہ شعر کے جملہ اوزان میں نظم کی جاتی تھیں۔ گویا کس بھی بحر کے جملہ اوزان میں کہی چار چار مصرعوں پر مشتمل نظم رباعی کہلاتی تھی۔ اسی وجہ سے ممتاز رباعی گو مولانا جامی نے نفحات الانس میں مولانا رومی کی اس چار مصراعی کی رباعی کہا ہے:

یکے لحظہ ازو دوری نشاید
کہ ازدوری خرابی ہا فزاید
بہر حالے کہ باشی پیش او باش
کہ از نزدیک بودن مہر زاید

.....

اور اقبال نے بھی اپنی چار مصراعیوں کو جو اسی وزن میں ہیں رباعیات کہا ہے:

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

خلیفہ ہارون الرشید کے ہاتھوں البرامکہ کی تباہی پر ایک نئی صنف المووالیا ظہور میں آئی۔ البرامکہ ادب پرور لوگ تھے کئی شعرا ان کے دربار سے وابستہ تھے اور انعام واکرام سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ بیروزگار ہو گئے۔ المووالیا رثائی تھی۔ اس صنف میں یا موالی (البرامکہ) کے الفاظ دہرائے جاتے تھے۔ ڈاکٹر شوقی ضیف تغری بردی کی النجوم الزہرہ سے کلثوم بن عمرو العتابی جس کا سلسلۂ نسب عہد جاہلیت کے شہیر شاعر عمرو بن کلثوم سے براہ راست ملتا ہے، المووالیا کا یہ بند نمونے کے طور پر نقل کیا ہے:

یا ساقیاً خُصّنی بِما تَہواہُ
لا تمزج اقداحی رعاک اللّٰہُ
دعہا صرفاً فانّنی امزُجُہا
اِذ اَشربُہا بذکر مَن اہواہُ

یہ موالیا بصورت رباعی ہے اور وزن؟ وہ بھی بالکل رباعی کا ہے۔

فارسی میں شاعری کا آغاز صفاری دور میں ہوا۔ اس دور کے معروف ترین شعرا حنظلہ بادغیسی، فیروز مشرقی اور ابو سلیک گرگانی سے کوئی ایک بھی رباعی منسوب نہیں۔ سامانی دور میں شعراء کی پوری کھیپ موجود تھی۔ رودکی، شہید بلخی، موسیٰ فرالاوی، صالح ہروی، فضل ربنجی، معمری، دقیقی، محمد بخاری، منجیک ترمذی، غزالی لوکری، معروفی، منطقی، خسروی، قمری جرجانی، ابو طاہر، محمد ابو لوکجی، بدیع بلخی، استغنائی، ابوشکور بلخی، جنیدی، عمارہ مروزی، ترکی ایلاقی، ابوالمثل بخاری، ابوالموید بلخی، رونقی بخاری، معنوی، خبازی، سپہری ان میں سے کسی ایک سے بھی کوئی ایک بھی رباعی منسوب نہیں۔ سوائے ابوشکور بلخی (۳۳۶ھ میں زندہ) کی اکلوتی رباعی کے اور دعویٰ ہے کہ رباعی قدیم ترین نوع سخن ایرانی ہے جسے پروفیسر شیرانی بطور ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ ایک طرف یہ حال ہے اور ایک طرف احمد شہ وری یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ ایران میں قبل از اسلام بھی شاعری کا وجود تھا۔ ہر چند کہ از اشعار دورانِ باستانِ ایران آثار قابل توجہے نماندہ است اما بنظم بودن بخشے از اوستا شبہہ در مورد خوے ایرانیاں بہ سخن گفتن منظوم باقی نمی گزارد۔ غیر از اوستا کہن ترین اثر منظومے کہ بما رسیدہ است ایاتکار زریراں است کہ بخشے ازاں بنظم است۔ لیکن ایاتکار زریراں سے کوئی ایک مصرع بھی بطور مثال نقل نہیں کیا کہ معلوم ہو سکے کہ ایرانی شعر کہتے تھے۔ شعر کہتے ہوتے تو اپنا نظام عروض (Prosody) بھی ہوتا۔

پروفیسر حافظ محمود شیرانی علم وفضل میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ مجھ ایسے ان کی جوتیاں سیدھی کرنے کے بھی قابل نہیں لیکن پٹھان ہونے کی وجہ سے:

ٹل نہ سکتے تھے وہ جس بات پہ اڑ جاتے تھے

....

جو پٹھان پختونخوا سے ہجرت کرکے غیر پختون علاقوں میں جا بسے پشتو زبان بھول بھی گئے ہوں تو بھی اپنے آپ کو پٹھان ثابت کرنے کے لیے ضد کو وصف خاص گمان کرتے ہیں۔ ارسطو افلاطون کا شاگرد تھا۔ استاد کے فلسفے پر تنقید کی تو شور مچ گیا۔ ارسطو نے یہ تاریخی الفاظ کہے:

Plato is very dear to me but truth is dearer than Plato.

افلاطون مجھے بہت عزیز ہے لیکن سچ افلاطون سے عزیز تر ہے۔ وہ مجموعۂ رباعیات، سخنانِ منظوم، جو ابوسعید ابوالخیر سے منسوب ہے اس میں کوئی ایک رباعی بھی ایسی نہیں جو کسی اور سے منسوب نہ ہو۔ محمد بن منور بن سعید بن ابی سعید ابی الخیر نے اپنی کتاب اسرار التوحید میں لکھا ہے کہ وہ ہر وقت عالم استغراق میں رہتے تھے، شعر گوئی سے شغف نہیں رکھتے تھے۔ مرورِ ایام نے غیر شاعر کو شاعر بنا دیا۔ یہ رباعی:

عشق آمد و شد چو خونم اندر رگ و پوست
تا کرد مرا تہی و پُر کرد ز دوست
اجزائے وجودم ہمگی دوست گرفت
نامے زمن برمن و باقی ہمہ اوست

(ابوسعید ابوالخیر، مولانا رومی، خواجہ عبداللہ انصاری، اوحد کرمانی، احمد غزالی)

یہی حال رباعیات خیام کا ہے۔ نجم الدین دایہ رازی کی مرصاد العباد کا ایک نسخہ جس کے اول و آخر کے صفحات ضائع تھے کسی کے ہاتھ لگا اور اسے خواجہ عبداللہ انصاری کی تصنیف گمان کرکے گنج نامہ کے نام سے مشہور کردیا۔ محقق طوسی سے منسوب معیار الاشعار بھی اسی طرح کی تالیف ہے جس کے اصل مؤلف کا کسی کو علم نہیں۔ علامہ عبدالوہاب قزوینی نے از روے چہ ماخذ؟ کہہ کر محقق طوسی سے اس کی نسبت کو غلط قرار دیا لیکن پروفیسر شیرانی نے توجہ نہ دی شاید اس لیے کہ وہ یہ اس کی بنیاد پر یہ طے کرچکے تھے کہ رباعی یا دوبیتی چہار بیتی کا ارتقائی نمونہ ہے۔ محقق طوسی ساتویں صدی ہجری کے شخص تھے اور رومی کے ہم عصر۔ چہار بیتی کا لفظ اس سے پہلے کی کسی تصنیف اور تالیف میں نہیں ملتا۔ دوبیتی کسی چہار بیتی کا ارتقائی نتیجہ نہیں بلکہ ترجمہ ہے بیتین کا جو تثنیہ کا صیغہ ہے یعنی دو بیت۔ تثنیہ کا صیغہ سوائے عربی زبان کے کسی اور زبان میں نہیں۔ فریقین دو فریق، حرمین شریفین، دو حرم شریف، مسجد کعبہ اور مسجد نبوی، نعلین دو نعل، پیزار، جب دو دو بیت پر مشتمل کلام کا رواج عام ہوا تو اس قسم کا کلام بشمول رباعی دوبیتی کہلایا جانے لگا۔ ابوالحسن ابن

لنگ معاصر مامون الرشید جس کی زبان مامون الرشید نے کھنچوا کر باہر نکال دی تھی، کے ذکر میں ہے وکان ابلغ شعرہ مالم یتجاوز البیتین والثلاثہ۔ یعنی اس کے اشعار دو بیت یا تین بیت سے تجاوز کرتے تھے:

زمانٌ قد تَفَرَّغَ لِلفضولِ
وَسَوَّدَ کُلّ ذی حمقٍ جھولِ
فَاِن اَحبتم فیہِ ارتفاعا
فکونوا جاھلین بلا عقولِ

(زمانے کے پاس فضول لوگوں کے لیے فراغت ہے۔ احمقوں کو سرداری کے منصب پر فائز کرتا ہے پس اگر تم رفعت چاہتے ہو تو جاہل اور عقل سے عاری ہو جاؤ۔

ہر دور میں یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے۔

رباعی ربع سے نہیں رباع سے ہے۔ ربع کا مطلب ہے چوتھا حصہ یعنی ۴/۱ ثلاث تیسرا حصہ، خمس پانچواں حصہ۔ رباع کا مطلب ہے چار چار اور رباعی چار چار والی یعنی چار چار مصرعوں والی۔ ثلاث تین تین اور ثلاثی تین مصرعوں والی۔ میں یہ ساری باتیں آج سے بیس بائیس سال پہلے 'فنون' میں بزمانہ ادارت احمد ندیم قاسمی لکھ چکا ہوں۔ بعد میں انہی مقالات کو سید محمد کاظم اور جناب محمد سلیم الرحمان نے کتابی صورت ''رباعی تحقیق و تنقید، میں ریڈنگز کے اشاعتی ادارے اِلقا پبلی کیشنز سے شائع کروایا۔ یہ کتاب مختلف ابواب (۱) ہشت صد سالہ مسئلہ رباعی (۲) رباعی تکنیک اور فن (۳) رباعی ہمہ جہت صنف سخن (۴) تحقیقات در رباعیات خیام (۵) رباعی فارسی میں (۶) رباعی عربی میں (۷) رباعی اردو میں پر مشتمل ہے۔

رباعی پر قبل ازیں دو کتابیں لکھی جا چکی تھیں، اردو رباعی از ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور اردو رباعیات از ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ مؤخر الذکر پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کے لیے لکھی گئی تھی۔ دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ ایک نے دوسرے کو لفظ بلفظ نقل کیا ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ ہر ایک سید سلیمان ندوی اور پروفیسر شیرانی کے درمیان کی گئی بحث میں ہر موقع پر پروفیسر شیرانی کی تائید و تعریف کی ہے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا:

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

تحقیق کسی کے لکھے ہوئے کو دہرانے، تائید اور تعریف کرنے کا نام نہیں بلکہ جانچنے پرکھنے اور تولنے کا نام ہے۔ جھوٹ سے سچ کو الگ کرنے کا نام ہے۔ لیکن نقار خانے میں:

کم قُلتُ و کم اَقُولُ لکن مَعَ مَن

☆☆☆☆☆

طالب انصاری کی نظموں کا مجموعہ ''درزیں''

معروف شاعر طالب انصاری کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''درزیں'' گزشتہ برس کے وسط میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ طالب انصاری غزل کے کہنہ مشق اور پختہ گو شاعر ہیں۔ نظم گوئی کا آغاز انھوں نے بعد میں کیا۔ میرا خیال ہے کسی شاعر نے اپنی نظم گوئی کا تعارف اتنے انوکھے اور تیکھے انداز میں نہیں کرایا۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

''میں تو غزل لکھنے والا آدمی تھا۔ میرا پہلا مجموعہ غزلیات پر ہی مشتمل تھا۔ یوں تو غزل میں بھی فکری سطح پر بے شمار امکانات موجود ہیں۔ نئے سے نئے مضامین نے غزل میں جگہ بنائی ہے۔ تاہم غزل میں میرا شعری رویہ معروف معنوں میں ترقی پسندانہ رہا۔ پھر یوں ہوا کہ اچانک نظم کی پری نے میرے دل کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر جھانکنا شروع کیا۔ پہلے تو میں نے توجہ نہ دی۔ یہی خیال کیا کہ شرارت کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد بھاگ جائے گی، مگر اس نے تو معمول بنالیا۔ جب بھی کچھ لکھنے کا ارادہ کرتا۔ یہ پردہ ہٹا کر آوازیں دیا کرتی۔ مجھے چھیڑتی، اپنی طرف بلاتی۔ میں کھڑکی کا پٹ بند کر دیا کرتا۔ یہ درزوں میں سے جھانکنا شروع کر دیتی۔ میں کھڑکی کھول کر اسے بھگانے کی کوشش کرتا اور یہ اپنی مسکان لیے وہیں جم کر کھڑی رہتی۔ دل کے گونجتے سناٹے میں ایک آواز گونجی:

اسے اندر بلالو۔ دوستی کرلو۔

تو میں نے نظم پری سے دوستی کرلی۔ ابتدا میں تو یوں کچھ کھچی کھچی رہی۔ شاید یہ سمجھتی ہو کہ میں اس کے ساتھ تادیر نبھا نہیں سکوں گا۔ یہ

جمیل یوسف

مجھے سمجھنے کی کوشش کرتی رہی اور میں اس کے خدوخال پر غور کرتا رہا۔ حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے اندر ایک جہان پوشیدہ تھا، جو میری گرفت میں نہیں آ رہا تھا میں اس کی کون سی جہت کو پکڑوں۔ ہر طرف ایک وسعتِ بے کراں تھی۔ دل میں وسوس پیدا ہوتے رہے کہ ایک معصوم سے دوستی کر تو لی ہے، اگر میں اسے سمجھ ہی نہ سکا اور حق دوستی ادا نہ کر سکا تو یہ سخت مایوس ہوگی۔ میں نے اس کے وجود کو سمجھنے کے لیے اسے صبح و شام کا ساتھی بنالیا۔ اب یہ ہر وقت میرے ساتھ رہنے لگی۔ بات بات پر مجھے گدگدانے لگی۔ اس نے میرے آگے خودشناسی کا ایسا آئینہ لا کے رکھ دیا، جس میں میری ہی ذات کے کئی زاویے منعکس ہونے لگے۔ ایسے زاویے، جن کا میں غزل میں اظہار نہ کر سکا تھا۔ ان زاویوں میں سب سے روشن زاویہ ماضی آفرینی تھا"

غزل سے نظم تک کے سفر میں جو کچھ انھوں نے لکھا، وہ بالکل درست ہے۔ میں طالب انصاری کو لگ بھگ تیس سال سے جانتا ہوں۔ ان کی غزلیں ملک کے معروف ادبی رسائل میں چھپتی رہی ہیں اور اب غزلوں کے ساتھ ان کی نظمیں بھی پڑھنے اور سننے کا موقع ملتا رہتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں طالب انصاری کی نظموں کا یہ مجموعہ "درزیں" اردو نظم کے سرمایے میں ایک اہم اضافہ ہے۔ یوں تو ماضی آفرینی کم و بیش ہر تخلیق کار کی فطرت میں شامل ہوتی ہے۔ تاہم کم ہی کسی شاعر کی نظموں میں ماضی آفرینی شاعری کے اتنے خوب صورت پیکر میں جلوہ گر ہوئی ہوگی۔ انداز بیان میں کہیں گنجلک پن یا ابہام نہیں ہے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں کمال شاعرانہ فن کاری سے کہہ دیتے ہیں۔ ان کی نظمیں قاری پر گہرا تاثر چھوڑتی ہیں۔ کہیں کہیں ان کا پیرایۂ اظہار مجید امجد کی یاد دلاتا ہے۔ ان کی نظموں کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ان کے نظمیہ اسلوب میں مضامین آفرینی کتنی شدت سے موجود ہے اور کیسا جداگانہ انداز لیے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاصر نظم نگاروں میں طالب انصاری کی نظم الگ سے پہچانی جاتی ہے۔ کسی شاعر کے لیے یہ خوش بختی کی بات سمجھی جانی چاہیے، اگر وہ قلم کاروں کے ہجوم میں اپنی الگ شناخت رکھتا ہو۔ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ان کی چار نظمیں قارئین کے ملاحظہ کے لیے پیش کر رہا ہوں:

خالی چرخہ گھوم رہا ہے

سوت کپاس بچا ہے باقی
اور نہ بچی ہے پونی
چرخے کے آگے بیٹھی ہے
گم صم ماسی جیونی

تیما دن تو بیت چکا ہے
شام ہے سونی سونی
بس سمجھنے ہی والی ہے اب
جلتی سانس کی دھونی
سو برسوں کا بوجھ سہارے
سارا بدن ہلتا ہے
چندھیائی آنکھوں میں
ہر اک منظر گھوم رہا ہے
دھاگا کب کا ٹوٹ چکا ہے
خالی چرخہ گھوم رہا ہے

.....

سویرا غم زدہ ہے

گھروں کے سب مکیں
اب دن چڑھے تک سوئے رہتے ہیں
نمازِ فجر کے ٹھنڈک بھرے لمحوں کی آوازیں
سنائی ہی نہیں دیتیں
سویرا جھانکتا ہے بند دروازوں کے باہر سے
اداسی سے جھکائے سر کھڑا رہتا ہے
دستک تک نہیں دیتا
بڑی بے چارگی سے دیکھتا ہے خواب آلود
زمانے کو
خموشی سے نکل جاتا ہے روشن دوپہر کی تپتی سڑکوں پر
سویرا غم زدہ ہے
بے نظارہ ہو گیا لیکن
اسے وہ اچھے دن بھولے نہیں ہیں
جب سحر پہلی کرنیں پھوٹتے ہی
سانولی سی روشنی بالائی منزل پر کھڑی منڈیر
سے کہنی ٹکائے
چڑیوں کی چہکار سنتی تھی
تو دل ہی دل میں
دن میں کرنے والے کاموں کی فہرست بنتی تھی
کوئی جب آنکھیں ملتا، دھم دھا دھم
سیڑھیوں سے تیزی سے نیچے اترتا تھا
دوپٹہ گھن لگے دروازے کی چوکھٹ سے
نکلے کیل میں جب جا اٹکتا تھا
تو دل کیسا دھڑکتا تھا
خرامِ ناز میں سکتہ
ٹھٹکنے کی ادائے خوش نظر جیسے
گزرتے لمحے رک جائیں
(گزرتے لمحوں نے یوں بھی سبک
رفتاریاں تو آج دیکھی ہیں)
غسل خانے میں پانی گرنے کی پُرشور آوازیں
یوں لگتا تھا کہ جیسے مست ہو کے نلکا بھی ملہار
گاتا ہو
کھلی ڈیوڑھی کسی سبزی کے ٹھیلے والے سے
تکرار کرتی تھی
فراوانی کے موسم میں بھی بھاؤ تاؤ تو ہر بار کرتی تھی
سویرا اب بھی آتا ہے
خموشی سے نکل جاتا ہے روشن دوپہر کی تپتی سڑکوں پر

.....

مرے پاس بس کنجیاں رہ گئی ہیں

خزانہ!

بہت قیمتی تھا خزانہ
کئی مرمریں خواب آنکھوں کی زنبیل میں رہ رہے تھے
حوادث کی رسّی سے جن کو
بہت کس کے باندھا ہوا تھا
خیالوں کا ریشم بھی تہہ خانۂ دل کی الماریوں میں رکھا تھا
پرانے کواڑوں کی خوش بو
دریچوں میں کھلتے ہوئے رنگ
سب کچھ کسی یاد کی پوٹلی میں بندھا تھا
عجب کیف آور مناظر تصور کے عدسے میں محفوظ تھے
بارشیں تھیں
کہانی سناتی، لحافوں میں خود کو چھپاتی
وہ جاڑوں کی راتیں
ہواؤں کی برفیلی دستک
سویرے کے آنگن میں چڑیوں کی چہکار
آٹے کی چکّی کی ہک ہک
کسی بات پر روٹھ کر تیری سانسوں کی کچی مہک میں
گندھے زیر و بم کے مدھر سُر
سماعت کی گٹھڑی میں محفوظ اب تک چلے آ رہے تھے
گزرتے، بدلتے زمانے نے ڈالا ہے ڈاکہ
جو تھا لے اڑا ہے
مرے پاس بس کنجیاں رہ گئی ہیں

....

بے سُری آوارہ گلیوں میں

انہی میلی کچیلی بے سُری آوارہ گلیوں میں
جہاں چھٹی کے دن اکثر تھڑوں پر تاش کی بازی لگا کرتی ہے
اونچے قہقہے جیون کی گتھی شام تک سلجھاتے رہتے ہیں

یہاں ہر گھر کے آنگن میں
کئی مرجھائے پھولوں کے بلکنے کی صدا
تاشوں کی کوڑی چھینٹے کے شور و غل میں ڈوب جاتی ہے
یہ نازک زرد رو غنچے
جو اپنی ناز کی مٹی پہ ننگے پاؤں چل کے آزماتے ہیں
ہوا کے سرد و نم آ گیں تھپیڑے ہنستے ہنستے سہتے جاتے ہیں
نمو کا ذائقہ پیمانۂ عسرت سے چکھتے ہیں

پرانے گھن لگے دروازوں پر بیٹھی ہوئی
پنکھا جھلاتی، سن رسیدہ عورتیں
یوں لگتا ہے جیسے پرانی داستانیں ہیں
انھیں خسرہ، بخار اور کالی کھانسی کے حکیمی نسخے ازبر ہیں
انھیں معلوم ہے یہ بھی
اگر بچے کی تختی ٹوٹ جائے تو
اسے پتری سے جڑوانے میں کتنا خرچ اٹھتا ہے
انھی دروازوں کے اندر دراسے صحن کی وسعت ہی
ان بدحال لوگوں کا اثاثہ ہے

مسائل بڑھتے جاتے ہیں
تو یاک دوسرے کی ران پر ہتھڑ جماتے ہیں
تھڑے پر تاش کی بازی لگاتے ہیں

☆☆☆☆☆

محفلِ نعت پاکستان کا ایک خوبصورت نعتیہ ردیفی مجلّہ

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، ہر کوئی اپنے اپنے انداز سے اس کے خیر مقدم کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس مناسبت سے راقم السطور اپنی تقدیسی اور عقیدتی کیفیات کا اظہار حال ہی میں محفلِ نعت اسلام آباد کی جانب سے شائع ہونے والے ایک نہایت ہی دیدہ زیب مجلّے کے ذکر سے کر رہا ہے۔

محفلِ نعت گزشتہ پینتیس برس سے حمد و نعت سے وابستہ واحد ایسی تنظیم ہے جس کے زیرِ اہتمام ہر مہینے باقاعدگی سے نعتیہ مشاعروں کا انعقاد ہو رہا ہے۔ اس نعتیہ تنظیم کی بنیاد اپریل ۱۹۸۹ء میں پڑی تھی، جڑواں شہروں میں محفلِ نعت اور بزمِ حمد و نعت ہی ایسی تنظیمیں ہیں جو پوری باقاعدگی کے ساتھ ماہانہ تقدیسی محافل منعقد کر رہی ہیں۔ محفلِ نعت کو یہ انفراد حاصل ہے کہ ماضی قریب میں اس کی شاخیں کراچی، لاہور، حسن ابدال اور سرگودھا میں بھی قائم کر دی گئی ہیں جن میں سے حسن ابدال میں قائم کردہ شاخ بھی مرکزی تنظیم کی طرح باقاعدگی سے نعتیہ مشاعرے کروا رہی ہے، محفلِ نعت کے عہدیداروں نے اسلام آباد میں محفلِ نعت کی خواتین کی شاخ بھی قائم کر دی گئی جس کے اجلاس بھی ہر مہینے ہو رہے ہیں، محفلِ نعت کی اس خواتین کی شاخ کے علاوہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ان دونوں تقدیسی تنظیموں کے نعتیہ مشاعروں میں خواتین شرکت نہیں کرتیں۔

''محفلِ نعت'' کے زیادہ تر نعتیہ مشاعرے تو غیر طرحی ہوتے ہیں جس میں تمام شعرائے کرام اپنا کلام پیش کرتے ہیں۔ تاہم ۲۰۰۸ء سے ہر سال اپریل کے مہینے میں کراچی کی ایک بیحد فعّال حمد و نعت سے وابستہ تنظیم ''دبستانِ وارثیہ'' کے تعاون سے ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک ''ردیفی نعتیہ مشاعرہ'' بھی منعقد کیا جاتا ہے، دبستانِ وارثیہ کے بانی اور صدر سید قمر وارثی ایسے ہی ردیفی مشاعرے پاکستان کے مختلف شہروں میں کئی سال سے منعقد کروا رہے ہیں اور سال بھر میں ہونے والے ایسے بارہ ردیفی مشاعروں کی ردیفوں کی فہرست سال کے آغاز میں ہی دے دی جاتی ہے۔ یہ ردائف مختلف شہروں کے نعت گو شعراء کے مشورے سے مرتّب کی جاتی ہیں۔ چند برس پیشتر تک ایسا ہی ایک ردیفی نعتیہ مشاعرہ ہر سال جدہ، سعودی عرب میں بھی ہوتا تھا جس میں راقم السطور اپنے سعودی عرب میں قیام کے

نسیمِ سحر

دنوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتا تھا۔ صد افسوس کہ اب جدہ کی شعری اور تقدیسی محافل کئی شعرا کے وطنِ عزیز واپس چلے جانے کے سبب ویران ہو چکی ہیں۔

جڑواں شہروں میں ہونے والے اس ردیفی مشاعرے میں ہر سال دوسرے شہروں اور مضافات کے لوگ بھی ردیفی نعتیں کہہ کر بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ ۲۰۰۸ء سے جاری ہے۔ ہر سال اپریل کے مہینے میں ہونے والا یہ مشاعرہ صرف ۲۰۲۰ء میں کرونائی وبا کے پیشِ نظر اپریل کے بجائے نومبر کے مہینے میں منعقد کیا گیا۔ یوں اس کی باقاعدگی کا تسلسل ان دشواریوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جاری و ساری رہا۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہر سال کے تمام ردیفی مشاعروں میں پیش کیے جانے والے تقدیسی کلام کو اگلے سال کتابی صورت میں بھی دبستانِ وارثیہ کی اشاعتی سرگرمیوں کے تحت پیش کیا جاتا ہے اور یوں یہ کلام مشاعروں سے آغاز ہونے کے بعد تمام تقدیسی و شعری حلقوں تک رسائی پاتا ہے۔

محفلِ نعت کی انتظامیہ قابلِ صد تحسین ہے کہ اس نے سالِ گذشتہ سے ان سالانہ ردیفی نعتیہ مشاعروں میں پڑھے جانے والے کلام کی تدوین اور اشاعت کا پروگرام بنایا ہے جب سن ۲۰۲۰ء کے ردیفی مشاعرے کی روداد اور اس میں پیش کیا جانے والا ردیفی نعتیہ کلام ایک خوبصورت مجلّے کی صورت میں شائع کیا گیا تھا۔ اب اس سلسلے کا دوسرا مجلّہ ۲۰۲۳ء کی ردیف ''حضورِ مکرّم'' میں ہونے والے نعتیہ مشاعرے کی روداد کے علاوہ کچھ دیگر اہم تحاریر پر بھی مشتمل ہے، اس مجلّے کی ضخامت ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے تاہم اس کی مقداری اہمیت سے کہیں بڑھ چڑھ کر اس کی معیاری اہمیت ہے۔ مناسب ہوگا کہ یہاں محفلِ نعت کے عہدیداروں اور اراکینِ مجلسِ عاملہ کا ذکر کر دیا جائے جن کی مشترکہ کاوشوں سے اس مجلّے کی اشاعت ممکن ہوئی۔ محفلِ نعت کے سرپرست پروفیسر ڈاکٹر احسان اکبر ہیں، سید ابرار حسین اس کے صدر، سید محمد حسن زیدی نائب صدر، جناب عرش ہاشمی سیکرٹری، پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین صدیقی جوائنٹ سیکرٹری اور نصرت یاب نصرت سیکرٹری نشر و اشاعت ہیں۔ اراکینِ مجلسِ عاملہ میں عبد القادر تاباں، حافظ نور احمد قادری، احمد محمود الزماں اور عبد الرشید چوہدری شامل ہیں۔

یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ جناب عبد الرشید چوہدری نے، جو گوجری زبان کے صاحبِ کتاب نعت گو شاعر ہیں، اس مجلّے کی بلا معاوضہ کمپوزنگ کا اعزاز حاصل کیا، جس کے لیے وہ بلاشبہ اجرِ عظیم کے مستحق ہیں۔

اس مجلّے میں سید ابرار حسین کا پیغام، سالانہ ردیفی نعتیہ مشاعرے ۲۰۲۳ء کی روداد بہ قلم عرش ہاشمی کے علاوہ سید محمد حسن زیدی اور راقم السطور کے مضامین بھی شامل ہیں، جبکہ جناب عرش ہاشمی کا ایک خصوصی مضمون محفلِ نعت

پاکستان کے لیے ڈاکٹر ملک ذوالفقار دانش (مرحوم) کی خدمات کی مناسبت سے بھی شامل ہے جن کا انتقال ۲۰۲۰ء میں کرونا اور عارضۂ قلب کے سبب ہوا اور جن کے فیض اور نعت گوئی سے عشق کے تحت محفلِ نعت حسن ابدال شاخ کا قیام بھی عمل میں آیا تھا۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

۲۰۲۳ء کے اس ردیفی نعتیہ مشاعرے میں اُنیس شعرائے کرام نے شرکت کی جبکہ دوسرے شہروں میں مقیم آٹھ نعت گو شعرا بوجوہ خود تو شرکت نہ کر سکے مگر اس ردیف میں اپنا نعتیہ کلام بھیجنے کی سعادت حاصل کی جسے مختلف دوستوں نے اس ردیفی مشاعرے میں پیش کر کے اُن کی بھی اس تقدیسی محفل میں حاضری لگوا دی۔ ان حاضری لگوانے والوں میں راقم السطور کا نام بھی شامل تھا کہ طبیعت ناساز ہونے کی بنا پر ذاتی طور پر شریک نہ ہو سکا مگر دو ردیفی نعتوں کے ذریعے شمولیت ہوگئی۔

اس ردیفی مشاعرے میں حصہ لینے والے تمام شعرائے کرام کے چنیدہ ردیفی اشعار کا انتخاب دینا تو اس کالم کی محدود گنجائش کے تحت ممکن نہیں، تاہم ذیل میں چیدہ چیدہ منتخب اشعار پیش کیے جا رہے ہیں:

نہیں جن سے کردار میں کوئی بڑھ کر
وہ خلقِ مجسّم، حضورِ مکرم
سید ابرار حسین شاہ

عمل کرتے احکام رب پر بہر دم حضورِ مکرم
کیا کرتے اللہ کی حمد پیہم، حضورِ مکرم
سید ضیاء الدین نعیم

ہدایت کے محور حضورِ مکرّم
دو عالم کے سرور حضورِ مکرّم
سید محمد حسن زیدی

نگاہِ کرم ہو اِس اُمت پہ آقاؐ، نگاہِ کرم ہو
بس اک آسرا ہے نگاہِ کرم کا، حضورِ مکرّم
عرش ہاشمی

فلسطین، کشمیر، شام و یمن پر ہو اک چشمِ رحمت
ہوئے اُمتی آج پھر بے ٹھکانہ، حضورِ مکرّم
ڈاکٹر کاشف عرفان

زباں وقفِ مدحت، حضورِ مکرّم
ہیں آقائے رحمت، حضورِ مکرّم
حافظ نور احمد قادری

دلوں میں رواں ہے، دواں ہے مسلسل
سدا سے وِلائے حضورِ مکرّم
نسیمِ سحر

سرِ حشر ہم کو یقیں ہے، ہماری
کریں گے شفاعت حضورِ مکرّم
قمر وارثی

نعت گو شعراء کی اطلاع کے لیے یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ ان شاء اللہ العزیز اپریل ۲۰۲۴ء میں جو سالانہ ردیفی نعتیہ مشاعرہ جڑواں شہروں میں منعقد ہوگا اس کی ردیف "تصوّر" ہے۔ چنانچہ سب نعت گو حضرات ابھی سے تصوّر میں روئے رسولِ اکرمؐ کو لا کر نعت گوئی میں اپنی توفیقات کا اظہار کرنے کی تیاری شروع کر دیں۔

☆☆☆☆☆

ایوب اختر ایک جملہ ساز کہانی کار

ایوب اختر سے میری ملاقات 2004 میں ہوئی، جب یہ قرشی دواخانہ میں ریجنل مینیجر کے طور پر کام کرتے تھے اور گاہے گاہے واہ کینٹ میں امور سرکار نبھانے آیا کرتے تھے۔ اور شام کو واہ کینٹ کے ادب دوستوں کے ٹی ہاؤس سنگم کیفے پر ضرور تشریف لاتے۔ کہاں ایک نجی ادارے کی تھکا دینے والی مصروفیات اور کہاں ایک کہانی کار کے طبعی میلانات۔ دونوں سمتیں الگ الگ رجحانات کی متقاضی تھیں، یہ تو منافع کے خارزاروں میں محبت کے پھول کھلانے والی بات ہوئی۔ معلوم نہیں یہ دونوں ابعاد کو کیسے نبھاتے رہے۔ بہرحال واہ کینٹ کا ادبی ماحول ان کی سرکاری مصروفیات کی تھکن اتار دیتا تھا۔ بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اپنے طبعی رجحانات کے خلاف کام کرنا پڑ جائے تو انسان کی مخفی توانائیاں زیادہ قوت کے ساتھ اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ ایسے تخلیق کار کو زندگی کی بھاگ دوڑ میں اپنے شوق کی تسکین کی لیے ان اوقات کی قربانی بھی دینا پڑتی ہے، جن پر اہلِ خانہ کا حق ہوتا ہے۔

ایوب اختر کبھی کبھی صریر خامہ واہ کینٹ کے اجلاسوں میں بھی اپنا کوئی افسانہ سنایا کرتے تھے اور میں ان کے چہرے کو دیکھا کرتا تھا کہ شکل و شبات میں قدرے سخت تاثرات لیے ہوئے یہ شخص اپنے بطون میں کیسی کوملتا رکھتا ہے۔ ان کی تین کتابیں منصۂ شہود پر آئیں اور ہر کتاب افسانوی ادب کے افق پر روشن ستارے کی طرح چمکی۔ مٹی کے خواب، پچھلے پہر کی بارش اور وقت کے پیراہن ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ اس وقت میرے پیش نظر ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''وقت کے پیرہن'' ہے۔

ایوب اختر کا نام افسانوی ادب میں غیر معروف نہیں ہے۔ ان کے افسانے ''فنون'' جیسے موقر ادبی جریدہ میں شائع ہوتے رہے اور یہ مقام انہیں مسلسل محنت اور

طالب انصاری

افسانے کی دنیا کے ساتھ غیر مشروط وابستگی نے عطا کیا ہے۔ جیسا کہ ہر سچے فن کار کا خاصہ ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنے اردگرد سے ہی اپنی کہانیوں کا مواد اکٹھا کرتا ہے۔ ایوب اختر کی کہانیاں بھی دیگر افسانہ نگاروں کی طرح ہمارے معاشرے کی اور ہمارے رویوں کی عکاس ہیں، مگر ان کی کہانیوں کی بنت اور بات سے بات پیدا کرنے کا انداز ایسا بھرپور اور توانا ہے جو انہیں انفراد عطا کرتا ہے۔ افسانے کی ایک بڑی خوبی یہ بھی سمجھی جاتی ہے کہ ایک اچھی نظم کی طرح اس میں کوئی سطر زاید از ضرورت نہ ہو۔ افسانے کا بیانیہ ایک فطری روانی کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔ ایوب اختر کی تحریر میں رطب و یابس کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اسی لیے ان کے افسانے ایجاز و اختصار کی خوبی کے باوصف جامع ہیں۔ ایوب اختر کہانی کا خاکہ بنانا جانتا ہے۔ اس کے ہاں کردار نگاری، خاص طور پر منظر نگاری اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان کا اسلوب ایسا سادہ اور رواں ہے کہ قاری کہیں بھی الجھن کا شکار نہیں ہوتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کے ہاں جملہ سازی ایک ایسا اختصاص ہے، جو کم کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوا کرتا ہے۔ بعض سطروں پر تو یوں گمان ہوتا ہے، جیسے یہ کسی نظم کی سطریں ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو، ایوب اختر نے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے ہی کیا۔ ان کے درون میں چھپا شاعر ان سے شاعرانہ جملہ سازی کرواتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ ان کے افسانوں میں بعض اقتباسات ایمائیت کا ایسا رنگ لیے ہوتے ہیں، جو عام طور پر کسی نظم کی جان ہوا کرتے ہیں۔ اپنے کہے کو معتبر بنانے کے لیے میں چند جملے درج کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے:

''پراسراریت بھی دراصل ایک ابہام ہے اور مجھے ابہام کے حسن یا حسن کے ابہام پسند ہیں۔ کوئی مجھ سے میری عمر پوچھے تو میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں بیالیس سال کا ہو گیا ہوں۔ میں تو کہوں گا کہ میں نے اپنی عمر کے بیالیس سال گزار دیئے'' (ابہام)

''زندگی میرے خیال میں موت کی نعمت ہے'' (ابہام)

''تو کیا میں اتنا اکیلا ہو گیا ہوں؟
اداسی فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی اس کی آنکھوں میں آ کر بیٹھ گئی'' (گم شدہ کی تلاش)

''روشنی کی صاف اجلی چادر پر اندھیروں کے دھبے کالی مکھیوں کی طرح جگہ جگہ چپکے ہوئے ہیں۔ میں اس چادر کو جس طرف سے بھی اوڑھتا ہوں اندھیرے کا کوئی نہ کوئی دھبہ میرے کسی نہ کسی حصے کو چپ چاپ کھانے لگتا ہے'' (دھبے)

''ہمیں عشق قاف کے دو نکتے سمجھتے سمجھتے کیا پتا کتنی صدیاں لگیں
پھر ایک دن میں نے اس سے کہا
نہیں یہ کوئی دو نقطے نہیں ہیں
یہ اک دوسرے کو دیکھتے ہم ہی تو ہیں

آؤ اپنے آپ میں اتر جائیں
روشن ہو جائیں"
کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ مذکورہ بالا سطروں پر کسی نثری نظم کا گمان گزرتا ہے۔ یہ ایک افسانے بعنوان "کہانی" کا اختتامیہ ہے۔ یہ اختتامیہ سطریں جہاں افسانے کے مرکزی خیال کو اجاگر کر رہی ہیں، وہیں انہیں اگر افسانے سے ہٹ کر پڑھا جائے تو بھی یہ اپنے متن میں ایک مکمل مضمون کی حامل ہیں۔ لہٰذا یہ کہنے میں کچھ اڑچن نہیں کہ ایوب اختر کے افسانوں کی سطروں میں بھی ذہین قاری کے لیے ایک الگ کہانی موجود ہوتی ہے۔ یہ سطریں بظاہر تو مرکزی کہانی کا حصہ ہوتی ہیں، مگر ان میں بین السطور ایک اور کہانی جھلکیاں دکھاتی ہے۔ چند سطریں اور دیکھیے کہ کیسے ان سطروں میں ایک الگ کہانی سمو دی گئی ہے۔

"ماں بتاتی ہے کہ اس نے پیدا ہوتے ہی مجھے بوجھ لیا تھا۔ گھر میں غربت کی وجہ سے ماں کا دودھ کم تھا۔ لیکن اس نے جیسے تیسے ساگو دانے کی کھیر کھا کر اپنا دودھ بڑھایا، مگر ایک دن دکان والے نے ماں کا ہاتھ چھو لیا۔ بس اس کے بعد ماں نے مجھے دودھ نہیں دیا۔ میں بکریوں کا دودھ پیتی رہی" (کہانی)

"الف سے یے تک حرفوں کا ایک خاندان ہے، جو دنیا کی تمام زبانوں کے تمام لفظوں تک پھیلا ہوا ہے۔ 'ا' سے ترتیبی دوری کے باوجود 'ل' اور 'ف' کی 'ا' کے ساتھ جڑت اس خاندان کی تنظیم کا ایک حسن ہے" (انگلی تلے چھپا ڈور)

"محبت کی میم سے ع، ش، ق تک کے سفر میں صدیاں بیت گئیں" (ازل سے ابد تک)

"اس کہانی کا مُدھ صدیوں پر محیط ایک خاموش سفر ہے۔ اس تمام سفر میں میرے ہم راہ وہ بھی خاموش تھی۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھتے، سوچتے اور پڑھتے رہے، مگر چپ رہے۔ یہ ایک طرح کا چھپن چھوت کھیل تھا۔ جس میں آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔ تو کیا ہم ایک دوسرے کو پکڑنے، چھو لینے کی کوشش میں بھاگ دوڑ رہے ہیں؟ زندگی اس سوال میں الجھی ہوئی تھی کہ ایک دن اچانک ----- اس نے مجھے پکڑ لیا (کہانی)

ایوب اختر ایک ایسا افسانہ نگار ہے، جو کہانی کو تشریحی انداز میں بیان نہیں کرتا۔ ایک طویل اقتباس لکھنے کے بجائے وہ علامتی جملہ سازی کا سہارا لے کر اپنی بات کو ایک یا دو سطروں میں سمو دیتا ہے۔ "ازل سے ابد تک" افسانہ کی تین، چار سطریں درج کرتا ہوں جو اشاریت، ایمائیت اور فن کارانہ احساس سے مملو ہیں اور میرے انتقاد کی تائید بھی کرتی ہیں۔ انہیں اگر افسانے کے تناظر میں پڑھا جائے تو قاری اداسی کے نامختتم راستوں پر چل نکلتا ہے۔ الگ اقتباس کی صورت میں بھی یہ انتہائی پر اثر ہیں۔ مدت مدید کے بعد محبوب اور محب کی اچانک ملاقات سے پیدا ہونے والے بے ساختہ مگر غم انگیز احساس کو ایوب اختر نے کیسے عمدہ پیرائے میں

اجاگر کیا ہیں۔

"دروازہ کھلا تھا۔ تم نے دروازے کا پٹ کھٹکھٹایا۔ گھر میں زندہ آتمیں ایک دم، ایک ساتھ مسکرائیں۔ مسکراتی، گاتی، گنگناتی ان گنت خوش بوئیں مجھے دروازے کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ میں تمہاری طرف ننگے پاؤں دوڑا مگر وہ ایک ایک لمحے میں بھاگتی صدیاں اور سر پر اڑتی ہوئی یادوں سے بھرا آسمان--- بچپن، لڑکپن اور جوانی کی کتنی ہی تصویریں بناتے ہوئے رنگ--- تم تک پہنچتے ہوئے صدیاں بیت گئیں--- تمہیں دیکھا تو--- تمہاری وہ تصویر--- تم سچ مچ صدیاں اوڑھے کھڑی تھیں"

ہمارے ارد گرد بے شمار کہانیاں بکھری ہوتی ہیں۔ ان کہانیوں کو افسانوی بیانیہ میں سمونا ہی ایک اچھے فن کار کا شناس نامہ ہوا کرتا ہے۔ افسانے کے مروجہ فنی اسلوب کو برتتے ہوئے جو فن کار بہترین اور موثر بیانیہ تخلیق کرنے میں کام یاب ہوگا، اس کا لکھا زندہ رہ جانے کی توانائیوں سے بھرپور ہوگا۔ ایوب اختر ایسا افسانہ نگار ہے، جس کا بیانیہ انتہائی اثر انگیز ہے۔ یہ بھی ایک معمول کی بات ہے کہ ہر فن کار کا ایک ماضی بھی ہوتا ہے، بیشتر فن کار ماضی کے حصار سے باہر نہیں نکل پاتے۔ ان کی تحریروں میں غیر شعوری طور پر ان کے گم گشتہ ماحول کی پرچھائیاں اپنی جگہ بناتی ہیں۔

ایوب اختر کے ہاں بھی اس کے ماضی نے حیرت انگیز گل کاریاں کی ہیں۔ اس کے ہاں گزرے ہوئے دیہاتی ماحول کی منظر نگاری پوری قوت کے ساتھ موجود ہے۔ ایوب اختر کا بچپن اور لڑکپن سون سکیسر کے پرفضا مقامات میں شامل ایک گاؤں میں گزرا۔ وہ جگہیں انسان کے ذہن میں پتھر پر لکیر کی طرح ثبت ہو جاتی ہیں، جہاں اس نے بچپن گزارا ہو اور ہم جولیوں کے ساتھ مل کر شرارتیں کی ہوں۔ اپنے ماحول سے کٹ جانا اور نئی جگہ پر اپنی جڑیں لگانے کا عمل دشوار ہونے کے ساتھ ساتھ تکلیف دہ بھی ہوا کرتا ہے۔ ایک اچھا تخلیق کار ان یادوں کو اپنی تحریر میں سمونے کا ہنر جانتا ہے۔ یہ یادیں تخلیق کار کو توانائی دیتی ہیں، اسے زندہ رہنے کا حوصلہ دیتی ہیں۔ وہ اپنی جنم بھومی سے تو نکل جاتا ہے، مگر جنم بھومی اس کے اندر سے نہیں نکلتی۔ تخلیقیت میں یادوں کو سمونے کا یہ عمل سراسر روحانی عمل ہے، جس کی بنیاد احساس پر استوار ہوتی ہے۔ یوں کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی کہانیاں لمحہ بہ لمحہ بدلتے زمانے اور اس تبدیلی کے بطون سے پیدا ہونے والے تجربات کا بھرپور بیانیہ ہیں۔ ایوب اختر کے افسانوں سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے، جو ہمیں اس کے بچپن اور لڑکپن کی پرچھائیاں دکھانے کے ساتھ ساتھ اس کے روحانی عمل کا پتا بھی دیتے ہیں۔

"وہ باڑے کا دروازہ کھولے گی تو بکریاں اپنے کوٹھے کی طرف بھاگتی ہوئی بڑھیں گی۔ وہ

میمنوں کو ان کے کھونٹوں سے باندھے گی۔ اتنے میں اسے ماں کی آواز آئے گی۔

چارپائیاں گیلی ہو رہی ہیں ۔ جلدی کر، انہیں کوٹھے میں رکھ

وہ چارپائیاں اٹھا رہی ہو گی کہ ماں کی آواز پھر آئے گی

چارپائیاں رکھ کر چلنے پر ترائی بھی دیتی آنا

اچھا اماں وہ آہستہ ہو کر اونچی آواز میں بولے گی

پھر وہ بالٹیاں، گاگھریں پرنالوں کے نیچے رکھے گی

کوئی اس سے یہ نہیں کہے گا کہ بس کر۔ دیکھ کتنی بھیگ گئی ہے تو

یہ لے تولیہ، پنڈا پونچھ، بال خشک کر، کپڑے بدل۔ آ ادھر آ کے لیٹ جا (کہانی)

"اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ راستے لوگوں اور کثیف آوازوں کے شور سے اٹے ہوئے تھے۔ سورج کی گرم روشنی میں آگے بڑھتے، پگھلتے ہوئے ہر جسم کے ماتھے پر بھوک لکھی ہوئی تھی۔ وہ رک گیا۔ دال چاول والی ریڑھی کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک دو نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا، پھر اپنی اپنی پلیٹوں پر جھک گئے۔ اس نے تھوڑے سے پیسے ریڑھی والے کو دیتے ہوئے کہا۔ اتنے کی بھوک دے دو" (گم شدہ کی لاش)

"اکبر والے کھوہ کے پانی میں اس کی عظیم یادوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اس کے ایک طرف ایستادہ توت کے درخت تلے گاؤں کے بڑے بوڑھوں اور آتے جاتے راہیوں کا میلہ لگا رہتا تو دوسری طرف اس کی بھل پر بندھے ہوئے لوٹوں سے گرتے ہوئے پانی کی دھاروں میں چمکتی ہوئی گاگروں سے پھسلتی کہانیاں اور ان کہانیوں کی صبحوں، شاموں میں پھیلی زندگی کے ہنستے، مسکراتے رنگ، باتوں، مسکراہٹوں اور چوڑیوں کی چھن چھن میں جگہ لیتی ہوئی سرگوشیاں، کھلے کھلے سرخ گلابی چہرے، سنہری خوابوں سے بھری آنکھیں، صاف اجلے آنچل اور اپنی اس شان پر اتراتا، مچلتا ہوا اکبر والا کھوہ اپنی طرف آتے ہوئے سب راستوں اور پگ ڈنڈیوں میں اس کی جان تھی، جنہیں وہ اپنی رگوں کی طرح محسوس کرتا" (وقت کے پیرہن)

"درزی کو نئے کپڑوں کا ناپ دیتے ہوئے —— شادی والے گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے، قبول ہے، قبول ہے سنتے ہوئے، غسل کے بعد تولیہ تار پر ڈالتے ہوئے، چکی کے دانوں سے بھری پوٹلی اٹھائے بھٹی پر جاتے ہوئے، واپسی پر پوٹلی میں سے گرم گرم دانے نکال کر کھاتے ہوئے، حاصل اور لاحاصل کا یہ حسین امتزاج، میری وہ عمر ہے، جو میں نے پل بھر میں گزار دی۔ اس پل سے صدیوں کی دوری پر اچانک تم مل گئیں۔ خوشی اور حیرت کا سکتہ ٹوٹا تو زندگی بدل چکی تھی" (ازل سے ابد تک)

ایوب اختر کے افسانوں کی المیاتی فضا مختلف جہتوں کے سوز کا تی ایک ایسے اداس مقام پر

پہنچتی ہے، جس کا قاری پہلے سے اندازہ نہیں کر سکتا۔ یہی خوبی قاری کو دھیرے دھیرے کہانی کے اخیر تک قرأت کرواتی ہے اور وہ غیر متوقع انجام دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ کہانی کے تانے بانے میں اس غیر متوقع انجام کا شائبہ تک نہیں گزرتا۔ ''وقت کے پیرہن'' افسانوی مجموعہ کی تمام کہانیاں اپنی بنت اور غیر متوقع انجام کی وجہ سے قاری کو مبہوت چھوڑ جاتی ہیں۔ جس طرح نظم ہوتی ہے یا نہیں ہوتی، ہم یہ بات کسی بھی ادبی فن پارہ کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ افسانہ بھی یا تو ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ مجھے ایوب اختر کی کتاب پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ ان کا کوئی افسانہ ایسا نہیں ہے، جس کے بارے میں کہا جائے کہ تخلیق کار کو اسے دوبارہ لکھنا چاہیے، ابھی مزہ نہیں آیا۔ اس حظ انگیزی کے تناظر میں یہ بات اختصاص کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کی کہانیوں میں تنوع پایا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایوب اختر کا دائرہ تخلیق کسی ایک جہت کا محتاج نہیں ہے۔ موضوعاتی سطح پر ایک ہی طرح کی کہانیاں پڑھ کر قاری اکتاہٹ کا شکار ہو سکتا ہے۔ ایوب اختر نے خواہ شعوری طور پر یا غیر شعوری سطح پر اس بات کا التزام کیا ہے کہ کہ ''وقت کے پیرہن'' میں ان افسانوں کو شامل کیا جائے جو فکری اور موضوعاتی سطح پر الگ شناخت رکھتے ہوں۔ کتاب میں شامل افسانوں کے مطالعے سے ایوب اختر کی فکریات کی مختلف پرتیں کھلتی ہیں۔ جن میں ایک نمایاں پرت خوف ہے۔ یہ خوف موت کے خوف سے لے کر بدلتے ہوئے وقت اور مناظر کی تبدیلی سے عبارت ہے۔ شاید انسانوں کی تمام تر نفسیات کا محرک یہی خوف ہے۔ خوف اور فوبیا میں فرق ہے۔ فوبیا بھی خوف سے ہی پھوٹتا ہے، مگر یہ ایک ذہنی مرض ہے۔ جب کہ خوف کو ایک مثبت احساس بھی کہا جا سکتا ہے۔ خوف کا یہی مثبت مگر غم انگیز احساس ایوب اختر کی کہانیوں میں جگہ بناتا ہے

ایوب اختر کا ''مٹی کے خواب'' سے لے کر ''وقت کے پیرہن'' تک کا افسانوی سفر نہایت خوش گوار ہے۔ ان کے افسانوں میں رومانوی تجربات بھی نہایت بلاغتِ فکر کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔ یوں کہنا مناسب رہے گا کہ ان کا عشق ایک سنجیدہ تجربہ ہے، جو ان کی مختلف کہانیوں میں ریزہ ریزہ موجود ہے۔ اس ریزگی کو اکائی مل جائے تو ان کے عشقیہ تجربے کا سراغ مل سکتا ہے۔ بہر کیف کتاب میں شامل تمام افسانوں کے مجموعی مطالعے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایوب اختر کی کہانیاں رومان، انسانی نفسیات، اور عصری ماحول سے ترتیب پانے والی الجھنوں کی عکاسی کرتی ہوئی کہانیاں ہیں، جن کے اثرات کو وہ بہترین جملہ سازی سے مزید نمایاں کرتا چلا جاتا ہے۔ خود بھی بھیگتا ہے اور اپنے قاری کو بھی احساس کی رم جھم میں شرابور کر دیتا ہے۔ میں اسے ایک کام یاب افسانہ نگار ہونے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

''شاید نہیں'' : رفیع حیدر انجم [مختصر تاثر]

پاکستان میں مقیم بعض قارئین کے لیے ممکن ہے یہ نام زیادہ جانا پہچانا نہ ہو یعنی انھیں قدرے نیا سا لگے۔ درحقیقت 'نیا' اور 'پرانا' ہونا بھی اضافیت کے خاص رخ کا موید ہوا کرتا ہے۔ جس نام اور کام کے بیچ کسی کے لیے اجنبیت حائل ہو، وہ اس فرد کے واسطے 'نیا' ہی قرار پاتا ہے۔ اس تمہیدی تناظر میں فی الاصل راقم کو اپنی بے خبری کا کچھ خجالت کے ساتھ اعتراف کرنا ہے کہ رفیع حیدر انجم کی کہانیوں سے پہلی مرتبہ بطور قاری اپنا رشتہ استوار کر پایا ہوں۔ باقی ان کی بابت یہ معلومات متون کا مطالعہ کرنے کے بعد مہیا ہوئی ہیں کہ جناب رفیع حیدر انجم کا تعلق ہندوستان کے صوبہ بہار سے ہے۔ انھوں نے افسانہ نگاری کا آغاز ستر کی دہائی کے وسط میں کیا۔ انڈیا کے ممتاز ادبی جریدے ''شاعر'' کے افسانہ نمبر (۱۹۸۱) میں وہ شامل تھے۔ ۱۹۹۸ء میں ''بے ارادہ'' کے ٹائٹل سے ان کا پہلا افسانی مجموعہ طبع ہوا۔ ۲۰۲۰ء میں انھوں نے اپنی سروس کا دورانیہ مکمل کیا اور اسسٹنٹ پروفیسر (اردو) کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

''شاید نہیں'' سے موسوم اس مجموعے میں عمومی روایت کے مطابق بھلے ہی ٹائٹل سٹوری بھی موجود ہے لیکن اس مرکزی سرنامے کو اپنی تمام کہانیوں کا ترجمان بنانا اس لیے بھایا کہ مصنف نے اس 'مقبول تیقن' سے عمداً فاصلہ اختیار کیا ہے جس نے 'سوچ سمجھ کر' واحد تعبیر کی حکمرانی کے لیے سدا راہ ہموار کی۔ ظاہر ہے جنھیں زعم خوب راس آیا ہو، وہ بھلا ادعا ایسے 'اعلا جوہر' سے کب دستبردار ہونے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ یوں ذہن اسی طرح بنا دیے گئے ہیں؛ جسے اپنے کہے پر کامل ایقان حاصل نہیں؛ جس کے وجود کا پیمانہ خود اعتمادی کی مے سے چھلک نہیں رہا؛ اسے کوئی بھی تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوگا۔ جی! ایسا ہی ہے، مگر کیا اس طرف پر مرکوز ہونے کی احتیاج نہ تھی کہ 'واحد متکلم' کے بس کا تریاق بھی 'واحد متکلم' ہونا ایسا گہرا بھید تو نہیں! اس عملی کلیے کے تحت شد و مد کے ساتھ پیش ہونے والا ہر بیانیہ اسی شد و مد کے ساتھ استرداد کا شکار ہوا۔ یوں ذہنی جارحیتوں کے باعث سماج علمی اناؤں سے 'نکو نک' بھر گیا! سو، سچی بات ہے 'شاید نہیں' کی نرم دستک

جمیل احمد عدیل

نے اس تخلیقیت کا خاموشی سے اثبات کرا لیا ہے جسے اس نے کسی نہ کسی سطح پر 'لاادریت' سے وصول کیا ہوگا۔ ایک صاحب دانش جب اپنی بات کو ایسا خوشنما سائبان فراہم کرنے میں کامیاب ٹھیرے گا تو کہانیوں کی پڑھت قاری کو اپنے کلاوے میں بھر لے گی۔

مانا کہ 'اعتقاد' کے باب میں یقینِ کامل سے شکتی کشید کرنا بہت مفید عمل ہوگا لیکن تخلیق اس ٹھوس حالت کو قبول کرنے میں متامل رہی ہے۔ اسے 'تشکیک' کے عنصر اور امکانی صورت سے مستفیض ہونا موزوں لگتا ہے، بالخصوص فکشن میں۔ رفیع حیدر انجم کے جتنے افسانے اس عاجز کی خواندگی کا حصہ بنے، ان سب میں زندگی کی تعبیریں اپنے بھرپور امکانات کے ساتھ موجود و موثر ہیں۔ ماجرے ہوں، مناظر ہوں یا کرداروں کے اندرونی و بیرونی قضایا ہوں، سب اپنے ممکنات کے جلو میں طلوع ہوتے ہیں۔

'فیصلوں' کے حصار سے آزاد، قطعی تعینات کے عیب سے منزہ افسانوں کا مطالعہ کشادگی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ آپ بھی اس تکنیکی رمز کی کارفرمائی دیکھیں گے کہ افسانہ نگار نے کئی کرداروں کو مسافرت کے عمل میں شامل کیا ہے۔ ان کا حرکت میں ہونا معروض کو پیہم تغیر آشنا رکھتا ہے اور واقعہ بھی غالباً یہی ہے کہ 'اوبجیکٹ' اپنے احوال کے ساتھ مسلسل چولا بدلنے کی خو سے دستکش نہیں ہوتا۔ اس طرح کہانی میں ایک شخص آخر تک 'وہی شخص' نہیں رہتا۔ وہ چپکے سے ایک دوسرے شخص کے قالب میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ''سفر ایک شہر کا'' میں ہم نشینی نے دونوں کرداروں میں Transference کا افسوں دکھایا ہے اور اس تبدل نے خارج کو نادر رخ دے کر سارے شہر کو دفعتہً مختلف کر دیا ہے۔ بارِ دگر عرض ہے کہ یہ 'مختلف' کر دینا بازیچۂ اطفال نہیں ہے۔ روایتی 'حقیقت نگاری' اسی لیے اکہری رہ جاتی ہے کہ وہ بیرون کو یک رخا دیکھتی اور دکھاتی ہے۔ وہ فکشن نگار جو تخلیقی توانائی سے تہی ہے یا اعصابی کمزوری میں مبتلا ہے وہ گرد و پیش کو اپنی انفعالیت کے تابع کر دیتا ہے کیونکہ معروض کی سرشت میں بہرحال جارحیت موجود ہے۔ بیرونِ ذات ہمہ دم موثر 'شر انگیز ہنگامہ' اگر حساس فرد کو فنا نہیں بھی کرتا تو بہت امکان ہے کہ اسے Agoraphobia یعنی فضا ترسی کا شکار بنا دے ___ لیکن رفیع حیدر انجم کو ایک سرجن کا انہماک نصیب ہوا ہے۔ وہ پورے اطمینان کے ساتھ زیرِ جراحت کا جرات کے ساتھ سامنا کرتے ہیں۔ یوں چھوٹے سے چھوٹا تغیر بھی ان سے چھوٹا نہیں ہے Objectivism کے ساتھ جڑی یہ جزئیات ان کے ہاں رسمی معاملے سے کافی بلند ہیں۔

اس طرح جس زماں کی گردش سے محولہ بالا افسانے کا خمیر اٹھایا گیا تھا، اس نے متخالف زاویوں کو خود پر مہربان کر کے نئی اکناف کو تقدیر

بنالیا۔ گزران نے جلی ہوئی رسی سے لے کر خالی صراحی تک جملہ نشانات کی حقیقت کھول کر رکھ دی ہے۔ شہر کائنات کا پھیلاؤ بھی تو فاصلوں کا موجد ہے، سو، ایسی 'ترقی' سے کیا حاصل؟ زمین کے مدار میں بھی اسیر رہیں تو ان فاصلوں کے المیوں کا مداوا کرنے کے لیے سریع الرفتار ذرائع پر کیا فخر کیا جائے؟ جس کے ترکش میں بجز دکھوں کے زہر میں بجھے تیروں کے کچھ نہیں ہے۔

مادیت زدہ میڈیا نے ناظر/ سامع کو سادیت پسند بننے پر مجبور کر دیا ہے کہ اب اس کی بصری/ سمعی لذت کا مصدر حزن ٹھہرا، چونکا دینے والی اندوہناک خبر ٹھہری اور ہر بار بڑھی ہوئی Intensity کے ساتھ ! تو: کھوکھلے لوگ، مصنوعی چہرے، مستعار ذہانت، اوپری تقریر، اتھلا تاثر--- کیا یہ الجھنوں کو سلجھنوں میں بدل لیں گے؟ اب یہ سارا قابہر بنای فکشن کے لیے ہے، جسے تعریض کے راستے سے مشاقی کے ساتھ کہانی کی بنیادی بنت میں جذب کر لیا گیا ہے۔ باقی مسائل حیات بھی اپنی جگہ 'افسانہ بن کر' بیان ہوئے ہیں لیکن شناخت کی پیاس نے جس دریا سے ربط بنایا ہے وہ ندرت سے معمور ہے اور اسی وصف نے کہانی کے اختتام کو غیر رسمی رجا کے ارمغان سے نوازا ہے نیز 'کچھ کہے بغیر' یہ باور کرا دیا ہے کہ سکینت کا گمشدہ تابوت دوسرے فرد کے اضطراب میں مضمر ہے۔ فاصلے کے روگ کی یوں تشخیص کر دینا کہ کہانی کو کہیں زک نہ پہنچے، جاں گسل تھا مگر افسانہ نگار اس کٹھنائی سے نبرد آزما ہوا اور انجام کار سرخرو ہوا!

''شاید نہیں'' کے نام سے پیش کیے گئے افسانے میں ایک حساس فن کار کے خواب کا 'ازلی بہاؤ' اس ساحل سے ہمکنار دکھایا گیا ہے جہاں 'کرائسز' رائج الوقت ہنگامے کو کم کرنے کی جانب توجہ مبذول کرا رہی ہے۔ نعرے کے بارود سے بھرا جو انقلاب ہمارے وجودوں میں ترازو کر دیا گیا ہے، اس میں قیامت کا شور ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ مذکورہ افسانے میں روایتی رستاخیزی سے انحراف اختیار کرتے ہوئے اس تعمیر نو کے لیے جگہ بنائی گئی ہے جس میں اگرچہ شکست سے مفر نہیں مگر ایک جدا خاکہ بہرحال اپنے خال وخد کے ساتھ ظہور کے لیے بے تابی چھپائے ہوئے ہے۔ آئن سٹائن نے کہا تھا: ''اثباتیت پسند دنیا کا کیٹلاگ بنانا چاہتے ہیں، میں دنیا کا ماڈل بنانا چاہتا ہوں۔'' متذکرہ افسانے میں ایک سے زاید کرداروں کی 'چپ' سے اس تکلم کی لطافت برآمد کی گئی ہے، جس سے قاری ایک بار ارتباط قائم کرلے تو اس کا لوں لوں ارتعاش شناس ہو جائے گا اور وہ ذات کے حشر اور باہر کی ترتیب کو اس زاویے سے دیکھنے کا خوگر ہونا چاہے گا جسے 'اپنی ایجاد' کہنا غلط نہ ہوگا۔ افسانہ 'انسٹنٹ فوڈ' نہیں جسے تیار کر کے قاری کے ذہن میں انڈیل دیا جائے۔ یہ تو اس کے تدبر کی خوابیدہ استعداد کو فعال کرنے کے مترادف عمل ہے جس کا منہاج قاری خود وضع کرنے میں بامراد ٹھہر سکتا ہے کیوں کہ افسانے میں اسی استفہام کو نیوکلیس بنایا گیا ہے: ''یہ سڑک کہاں جاتی ہوگی؟ کیا اس سڑک کے آخری سرے پہ

بھی یہی دنیا آباد ہے؟'' زیرِ تجزیہ افسانوی متن کی کرافٹ نے اسے امتیاز دیا ہے کہ یہ اپنی یکساں ابتدا اور انتہا کے ہمراہ اس وحدت کا پیش کار بنا ہے جسے ایک درجے میں زیست کا پروٹو ٹائپ کہنا چاہیے۔ اس 'نقشِ اول' کی اساس 'آرٹ' ہے، جو کسی بھی طرح 'سیدھی لکیر' کی مظہر نہیں۔ حمزہ اوائینٹس ہمبل سے مرعوب ہو کر اگرچہ ہتھیلی پر ایک گہری، صاف اور سیدھی لکیر کھینچ تو لیتا ہے اور صلے کے طور پر مورتی کی مثل خامشی بھی لبوں پر جم جاتی ہے مگر کیا یہ ساعت سرمدیت سے متصف ہے؟ ایسا نہیں! اس آن کے بعد پھر اسی گیس چیمبر ایسی زندگی کا سامنا کرنا ہوگا جس میں 'مذہ قدیمی پیچیدگیاں' کلبلا رہی ہیں اور کلبلاتی رہیں گی۔ ذہن کی اسکرین پر آڑی ترچھی اور مبہم لکیروں کا جال مقدر بن کر چپکا رہے گا۔ ہاں! جس گھڑی انقسام سے (عارضی) نجات مل جائے گی، بس اسی ایک گھڑی کے لیے طمانیت نازل ہوگی۔ اس کے بعد زار و زبوں زندگی کا زہریلا عفرا کمزور مکھی کو چاٹنا شروع کر دے گا! افسانہ نگار نے 'شاید نہیں' عنوان اسی لیے دیا ہے کہ ایک سی حالت ہمیشہ رہے، غالباً ایسا ہو نہیں سکتا:

بہشت میں بھی نشاط یک رنگ ہو تو غم ہے
ہو ایک سا جام شہد سب کے لیے تو سم ہے
(معری)

''توتلا عباس'' ایک تراشا ہوا فن پارہ ہے، جس میں افسانہ نگار نے نشان زد صورت حال کو اس قدر کلاکاری سے رقم کیا ہے کہ تحسین کی نگاہ بیدار ہونا چاہتی ہے۔ کم عمر گھریلو ملازم کے ظاہری قبح کو وساطت بنا کر گریز کو منزل متعین کرنا، کافی دشوار تھا مگر لکھنے والے نے میمنہ میسرہ کا کوئی زخم بھی نہیں کھایا اور کہانی کو اپنی جزئیات سمیت مُٹھی میں قید کر لیا ہے۔ یہی وہ نغمگی ہے جو شاعری ہی میں نہیں افسانہ نگاری میں بھی مطلوب رہتی ہے لیکن زندگی کا کڈھب پہلو کہانی لکھنے والے کو اکثر Melodramatics کی سہولت میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے؛ یوں غوغائی سا ماحول سطحی قاری کو متاثر کرنے میں بھی کامیاب رہتا ہے لیکن جس توانائی کو بین السطور رہ کر قیامت ڈھانی تھی؛ وہ معاملہ تشنہ رہ جاتا ہے۔ ہم سب بھی تو کالے کلوٹے توتلے عباس ہی ہیں۔ اپنے اپنے وجود کے محبس میں اسیر؛ کہیں سٹک جانے کی تمنا تہوں میں مخفی رہتی ہے اور اس بندی خانے کو توڑ نہیں پاتے: تا آں کار اس گورستان میں جا لیٹتے ہیں جس میں چھپے وجودوں کو نامعلوم صدیوں تک بے حس و حرکت رہنا ہے۔ ہاں! کوئی تو ہے جو اس زندان کی اونچی دیواریں پھلانگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ چاہے آجر اپنی تمامی دشنام اس کے تعاقب میں روانہ کر دے۔ وہ کسی کی صدا پہ کان نہیں دھرتا کہ اصل ساعت کی حس گردن کے قلادے میں نصب ہوتی ہے۔ اگر اس پٹے سے نجات مل گئی تو پھر کوئی آواز پیچھا نہیں کرتی۔ یہی آزادی کا مفہوم ہے۔ بہر رنگ ایک 'مفرور' اسی جرأت کی

بدولت اپنے لیے نئی دنیا دریافت کر لیتا ہے۔
'تو علا عباس' جہانِ نو کا وہ لکنت زدہ اور بدصورت فرد ہے جسے مصنف نے کشش کا محور بنا کر ایک انوکھی سمت کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔ Love Hate Relationships پر مبنی ندرت سے معمور یہ کہانی اپنی Narration میں جتنی سادہ ہے، اپنے Angular خیال میں اتنی ہی عمیق ہے۔ اس لیے کہ کسی کہانی کو متنی سطح پر دولخت کیے بغیر اس کی داخلی صورت حال کو Dichotomize کرنا ریاضت مانگتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس تنصیف کو ممکن کر دکھایا ہے۔ یوں خواندہ وقفے وقفے سے دوضربی نبض کے تجربے سے گزرتا رہتا ہے اور اس پر یہ سطور نئی معنویت منکشف کرتی چلی جاتی ہیں:

''عباس کے بارے میں جب بھی سوچتا ہوں تو نفرت کا کسیلا پن منہ میں بھر جاتا ہے۔''

''عباس ایک اچھا خادم ہے —— روکھی سوکھی جو دے دو وہی کھا لیتا ہے۔ عباس محنتی ہے، نیک ہے، شریف اور ایماندار ہے۔''

''یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں کیوں کرتا ہوں میں اس سے نفرت؟''

''ارے! یہ تو عباس ہے۔ کیسا بے خبر سو رہا ہے--- نیند میں کھویا ہوا، بدصورت مگر معصوم عباس۔''

اس افسانے میں راوی کا کردار اپنی مخولہ بے چینی کے ساتھ قدم قدم پر موجود رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو Logic سے Tight Compartments سے مستفید ہوتے ہوئے متعارض احوال کی منطقوں کو الگ الگ منطقوں میں مقید کر کے اپنے لیے اطمینان خرید سکتا تھا۔ اس نے ایسا نہ کر کے ایک طرح سے 'حقیقت پسندی' کو اپنایا ہے تاکہ قاری بھی اضطرار کے تجربے میں شریک ہو سکے اور جان سکے کہ 'بے آواز رہنا خوئے غلامی کے جرم کا ارتکاب ہے جو حکمرانی کی لت کو شہ دیتا ہے۔'

رفیع حیدر انجم کے افسانوں کا اختصار بلکہ ایمائیت (Suggestiveness) ان کی نمایاں تر خوبی ہے گویا افسانہ نگار کی مدرکہ نے یہ تربیت پائی ہوئی ہے کہ کیا نہیں لکھنا اور اشارت کو کیسے وسیلہ بنانا ہے۔ جس مواد کو انھوں نے 'فاضل' جان کر قلم زد کر دیا، وہ موجود مقدار سے دس گنا زائد ہو گا۔ یہ مشکل مرحلہ طے کر لینے ہی کی وجہ سے انھیں سادہ اسلوب عطا ہوا ہے۔ ایسی نزل عبارت افسانے کا اصل افسوں ہوا کرتی ہے۔ ایذرا پونڈ نے کہا تھا: ''جدید زمانے میں شاعری کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی فلوبیئر کی نثر کے حسن سے واقف ہو۔'' اس افسانوی مجموعے کے خالق نے بھی یقیناً اچھے نثر نگاروں کو پڑھ رکھا ہے، اسی لیے ان کے ہاں سپاٹ سادگی نہیں، جمال انگیز شگفتگی اور سلاست ہے جو چپکی کو ہمہ دم گرفتار رکھتی ہے !!!

☆☆☆☆☆

کوئی ایک لمحہ رقم نہیں ..... دلشاد نظمی

شاعری عکس حیات ہے

زندگی کے تلخ و شیریں واقعات کو سلیقے سے لفظوں کے پراہن پہنانا اور شعروں میں ڈھالنا بہت مہارت کا کام ہے۔ خاص طور پر غزل کہنا نہایت باریک بینی اور ریاضت طلب ہے۔ دو شعروں میں عمر بھر کے غم و آلام، عشق و محبت، ہجر و وصال اور دیگر جذبات کو بیان کر دینا شیشہ گری کے مترادف ہے۔

جمشید پور بھارت سے تعلق رکھنے والے شاعر دلشاد نظمی جو ایک طویل عرصہ سعودیہ میں رہے اور بین الاقوامی مشاعروں میں خوب شہرت رکھنے والے شاعر ہیں۔ جو مصرعے کی بنت سے لے کر شاعری کی تمام تر نزاکتوں سے واقف ہیں۔ بہت اچھا اور دل کو چھو لینے والا شعر کہتے ہیں:

عیاں نہیں مرے سخن کا جہان دلشاد مجھ پہ شاید
نظر تو حد نظر سے بھی اب کے پار ہو جانا چاہتی ہے

.....

کتاب ''کوئی ایک لمحہ رقم نہیں'' ایک سو باون صفحات پر مشتمل شعری مجموعہ ہے۔ جس کا انتساب اپنے والد کے نام کیا ہے۔ دلشاد نظمی صاحب استاد شاعر ہیں ایسا ایسا بہترین شعر ان کے ہاں موجود ہے کہ تحیر کی ایک نئی دنیا رقم ہے۔ یہ کتاب طویل غزلوں پر مشتمل ہے لیکن پوری غزل میں ایک بھی شعر بھرتی کا یا قافیہ پیمائی کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ہر شعر ایک کہانی ہے اور کہانی بھی معیار نبھاتی ہوئی۔ زبان اور الفاظ کی تزئین کا ثبوت پیش کرتی ہوئی:

زخم کھایا ہوا پنچھی ہوں مگر زندہ ہوں
وقت کی تیز ہوا کاٹ رہا ہوں پر سے

مرے اجداد کو شاید گلے ملنے کی عادت تھی
گریباں اب رفو گر ڈھونڈتا ہے دھجیاں لے کر

.....

ایسی ایسی علامات، تشبیہات اور استعارات آپ کو دو مصرعوں میں کائنات سمیٹتے دکھائی دیں گے کہ آپ بے اختیار داد و تحسین دیں گے:

ثمینہ سیّد

یہ سیاست بھی قلم کے خون میں شامل ہوئی
متن اب خود حاشیہ بردار طے کرنے لگے

....

یہ شعر تو ہماری پاک بھارت سیاست کی صورتحال کھول کر رکھ رہا ہے۔ قلم کی پاسداری بہت کم ہی رہ گئی ہے۔ زیادہ تو وہی لکھتے ہیں جو لکھوایا جاتا ہے۔

صحن کا بوڑھا شجر اندر ہی اندر کٹ گیا
دو مکاں ابھرے تو بٹوارے میں اک گھر کٹ گیا

فقط سر جھکا ، سر جھکا کے نکل جا
یہاں کالے شبدوں کے منتر بہت ہیں

عشق کرتے ہو تو پھر سود و زیاں مت سوچو
یہ سبق سیکھا ہے جلتے ہوئے پروانے سے

....

عشق و محبت کی دیوانگی کو عنایت بھرے لہجے میں اشعار میں ڈھالا ہے:

آنکھیں تھیں بند ذہن مگر جاگتا رہا
ہم سو رہے تھے جاگتی انجمن لیے ہوئے

....

کیسی جاگتی انجمن ہے نہایت مرصع شاعری ہے:

سیکڑوں کی صفوں سے نکل تو گیا مر کے سرحد سے وہ دیکھتا بھی رہا
ان کے قدموں نے قافلہ زدہ حادثے کس طرح سرزمینِ وطن پر لکھے

....

ان کے کلام میں اپنے گھربار، پیاروں اور وطن سے دوری کا نوحہ ہے۔ کیسے معاش کی تلاش میں انسان اپنے عزیز رشتوں سے دور رہنا گوارا کر لیتا ہے۔

گھر کے پودے کی حفاظت کا نہیں جن کو شعور
زیب دیتا ہے انہیں باغ کا مالی ہونا

طنز کے نشتر کو سہولت سے وہ شعر کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ اپنی فکر اور سوچ کی تلخی جو حالات کی عنایت ہے اسے شعریت کے سپرد کر کے وہ اپنے عہد کے دکھوں اور المیوں کی خوب عکاسی کرتے ہیں۔

یہ زندگی کا سفر ہے کہ تعزیوں کا جلوس
جسے بھی دیکھو وہی سوگوار چل رہا ہے

....

شاعری میں تعزیے اور کربلا کا ذکر دکھ کی شدت کے بیان کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ تہذیب و تمدن سے تاریخ و ثقافت سے جڑت ہے جو آلام کو علامت میں باندھ سکتی ہے:

مدہوش لڑکھڑائے آنکھوں کو ملتے ملتے
اٹھے جو دست نازک محراب ہو گئے ہیں

....

میر کا اشک طلب کرتا ہے آفاقی غم
فکر غالب کے لیے شرط ہے حالی ہونا

....

دلشاد نظمی صاحب نے زمان و مکاں کی حقیقتوں کو سلیقہ مندی سے شعر و نظم کے قالب میں ڈھالا ہے:

جب آئینے پہ دستک تو ایک ہی پل میں
بغیر آئینہ دیکھے کوئی سنور گیا تھا

....

دعا ہے کہ بے شمار عمدہ اشعار سے سجی یہ کتاب جناب شاعر کے لیے ادبی میدان میں ایک مضبوط سنگِ میل ثابت ہو۔ وہ مزید لکھتے رہیں اور کتابیں چھپ کر تاریخ کے اتار چڑھاؤ محفوظ کرتی رہیں۔ آمین

☆☆☆☆☆

سُریندر پرکاش کے افسانہ ''اجنبی کہانی'' کا تعبیر و تجزیہ: مابعد نوآبادیاتی سیاق و تناظر میں (بقیہ حصہ)

اِسی طرح جو میل پروٹیگنسٹ ہے، وہ بھی تو کئی ایک ملکوں کی خاک چھان کے انگلینڈ پہنچتا ہے - کہانی کی اصل پروٹیگنسٹ تو ایک عورت عائشہ ہی ہے، لیکن یہاں میل پروٹیگنسٹ کی بات ہے کہ وہ متعدد ممالک کی خاک چھاننے کے بعد برطانیہ پہنچتا ہے- اُس کا میل کاؤنٹر تو وِسٹن ہی ہے- میل کردار نے پروٹیگنسٹ کے ساتھ وہی کیا جو اُس کی سرشت میں تھا کہ عورت سے فائدہ اُٹھایا اور پھر دُم دَبا کے بھاگ گیا- انسانی تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے- اُس کو بڑا کامل بندہ سمجھا جاتا جو عورت کو دغا دے کر بھاگ جائے- یہ تو خاص طور سے مرد کی ذہنیت ہے- سولجرز اور ایکسپلورز اخلاقی حوالے سے اچھے لوگ نہیں ہوتے- اُن میں اکثر پَرلے درجے کے بدقماش اور دھوکے باز اور رذیل لوگ ہوتے ہیں، لیکن جو موڈرن ویسٹرن ایکسپلورز رہے ہیں، وہ تو اپنی اپنی حکومتوں کے ویسٹ کے سٹوُجو رہے ہیں- ویسٹ کے جاسوس رہے ہیں، جب مغرب نے افریقہ دریافت کیا تھا، وہ اس لیے کے اس کے پیچھے حکومتوں اور کارپوریشنز کو جو فائدے حاصل ہونے تھے، اُن فائدوں کے لیے اتنے کشٹ کاٹے گئے تھے -اِس افسانے کی کرافٹ مین شِپ نہایت عمدہ ہے، مصنف نے ایک بھی لفظ ضائع نہیں کیا- افسانے کے آغاز میں افسانہ نگار نے وِسٹن کے متعلق بتایا ہے کہ وہ کون ہے؟ وِسٹن یہاں پر کیوں آیا ہے؟ وِسٹن کیا ہے؟ اور وہ بنیادی طور پر کس کام کے ساتھ انسلاک رکھتا ہے؟ اور پھر یہ کہ وہ ایک مقام اور ایک جگہ پر لمبے عرصے کے لیے قیام پذیر نہیں رہتا اور ایک مقام پر لمبے عرصے کے لیے کام بھی نہیں کرتا- وِسٹن میں 'سینس آف بلونگنگ' تو سِرے سے ہی نہیں ہے- کئی ایک لحاظ سے وہ پہلے ہی صف بندی کر لیتا ہے کہ جب اُس کو دھوکہ دیتا ہے تو پھر اُس کے بعد دُم دَبا کر بھاگنا کیسے ہے؟ اور پھر یہ کہ وہ دھوکا دھڑی سے کام لے گا اور اس کے لیے بھی وہ پہلے سے ہی سب کچھ طے کر لیتا

نبیل احمد نبیل

ہے- دوسری پُرلطف بات یہ کہ مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ کس مخصوص علاقے میں کون سی پائپ لائن بچھ رہی ہے- امکان اغلب ہے کہ پاکستان اور ایران کے درمیانی حصے میں پائپ لائن بچھ رہی ہے یا پھر ایران کا کوئی مخصوص علاقہ ہے، جہاں پر پائپ لائن بچھائی جا رہی ہے- مصنف نے اُس علاقے کا امبجتری نام عمارہ رکھا ہوا ہے- بنیادی طور پر یہ کہانی 'انڈین اِنٹینسو' نہیں ہے- اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مصنف نے انڈیا سے باہر بھی وقت گزارا ہے؟ یا نہیں اور اگر کسی دوسرے ملک میں رہے ہیں تو کتنا عرصہ اور وہاں پر اِن کے مشاغل اور کام کاج کیا رہے؟

عائشہ کے کردار کو ہم تو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں- ایک وہ ہے جب وہ مشرق میں ہے اور وِسٹن کے ساتھ اُس کی شیفتگی کا دور ہے یا رکھیل کا اُس ایک رُوپ ہے اور پھر اُس کا دوسرا رُوپ ہے جب وہ انگلینڈ میں ہے، وہاں وہ محض ایک عورت نہیں ہے، وہ ایک بہت زبردست ایک مشرقی عورت ہے اور وہ اورینٹل ٹچ جو ہے، اور کاؤنٹر نیریٹر یا جو کاؤنٹر اَٹیک ہے یا یُوٹرن ہے- مغرب کی گاڑی گزر رہی ہے اور اُس نے شِست باندھ کر نشانا لگایا ہے اور مغرب کی اُس گاڑی کو اچانک روک دیا ہے- تیسرے موقع پر پھر مصنف مداخل کرتا ہے اور عورت کی اصل نفسیات کو سامنے لاتا ہے کہ اتنا سب کچھ ہونے کے باوُجود کیا وہ انتقام لینے آئی! اُسے سادہ انتقام نہیں کہا جا سکتا- وہ اُس عورت کی بہرحال اپنے محبوب کے ساتھ ملنے کی اَرج ہے، جس بھی صورت میں وہ کر سکتی ہے، اُس کے قریب رہنے کی وہ کوشش کرتی ہے- اورینٹل کا اوکسیڈینٹل کے ساتھ جو ایک رشتہ ہے، وہ بھلے مغربی اُس کو چھوڑ کر آ جائے، وِسٹن کا اپنے علاقے میں پلٹنا اور وہاں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قیام پذیر ہو جانا- کیا ہے؟ وہ افسانے کے قاری سے پوسٹ کولونیئل صورتِ حال کے وسیلے فہم اور عمیق انداز سے مطالعے اور تعبیر و تدقیق کا متقاضی ہے- وِسٹن کو لونیل ازم کی کسی نہ کسی پَرت کے ساتھ ایک لحاظ سے جُڑا ہوا تھا، اب اُس نے مشرق کو خیر باد کہہ دیا ہے، اور وہ اپنے علاقے میں مستقل واپسی کر کے بیٹھا ہوا ہے، ڈارکنگ جو علاقہ ہے، وہ بھی دیکھنے والا ہے کہ وہ انگلینڈ کا کون سا ایریا ہے؟ اور اس مخصوص علاقے کا مصنف نے ذکر کیوں کیا ہے؟ وِسٹن کی مارتھا کے ساتھ سیٹلمنٹ کے لیے وہ اس خطے کا ہی کیوں انتخاب کرتا ہے؟ اُس کی کہانی اور تاریخ کیا ہے؟ اور پھر کوڑھ کی بیماری کی کیا تاریخ رہی ہے؟ یہ ایک مختلف فکر اور طرز کا حامل افسانہ ہے- سُریندر پرکاش کی متعدد کہانیوں میں انڈین اساطیری عناصر و عوامل بہت واضح ہیں، جیسے سُرنگ، چھوڑا ہُوا شہر، کالی دُرگا، اور شکاری والی کہانی وغیرہ - سُریندر پرکاش کے زیرِ نظر افسانہ ''اجنبی کہانی'' میں کوئی اساطیری ٹچ نہیں ہے- یہ نفسیات کا بہت زیادہ استعمال کیا گیا ہے- دو عورتوں کی نفسیات کو دیکھا گیا ہے جن کا تعلق دو الگ الگ خطوں سے ہے، لیکن ہیں عورتیں اور دونوں کی نفسیات کیسے

اور کس انداز کی حامل ہے؟ اور پھر یہ کہ مارتھا اُس عورت کو مکمل طور پر 'انڈرسٹینڈ' کرجاتی ہے کیوں کہ وہ عورت ہے۔ وسٹن پوری طرح سے عائشہ کو بعد میں بھی سمجھ نہیں پاتا کہ وہ کیوں آئی ہے؟ اور وہ پچھتاتا بھی ہے تو بس واجبی سا ریگریٹ ہے۔ کوئی خاص اُس میں شدّت اور عمق نہیں ہے، لیکن وہ عورت پھر بھی اُس کے ساتھ کیوں لگتی ہے؟ اُس کے ساتھ ہی رہتی ہے، اُس کے بچوں کے ساتھ ہی رہتی ہے یا اُس کی فیملی کے ساتھ کیوں رہتی ہے؟ تو وہاں پر عائشہ کی وسٹن کے ساتھ محبت ہے۔ وہ وسٹن کو بہر حال اپنی محبت اور اپنی نفسیات سے باہر نہیں کر پائی۔ یہ بھی عورت کی نفسیات ہے کہ وہ اپنا پہلا پیار، پہلی محبت نہیں بھولتی۔ پہلے حوالے سے عورت اپنے آپ کو نہیں بھولتی۔ سُریندر پرکاش نے ایک تو زیرِ نظر افسانے میں عورت کی مخصوص نفسیات کی تکنیک کو اس افسانے میں استعمال کیا ہے اور پھر یہ کہ مصنف میڈیسن کے استعمال کی تکنیک کو اس افسانے میں بروئے کار لایا ہے۔ اِس میں میڈیکل فکشن کا ٹچ ہے۔ اس میں دوسری عالمی جنگ کا زمانہ، زخمی ہوں گے، ریڈ کراس کا عالمی ادارہ ہے، کوڑھ کی بیماری ہے، بیماروں کے لیے الگ سے بستی ہے اور بیماری کی تشخیص و تفتیش کے لیے ڈاکٹرز ہیں۔ اُردو ادبیات اور ہندوستانی اور پاکستانی کلاسیکی لٹریچر میں یہ ایک نئی چیز ہے، جسے میڈیکل فکشن کہا جاتا ہے۔ جیسے اُمیتابھ گوش کی کتاب 'کلکتہ کروموزوم' ہے، یہ میڈیکل فکشن ہے۔ اب یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ کوڑھ کی بیماری ایک سے دوسرے میں اس طریقے سے منتقل ہو سکتی ہے؟ جیسے عائشہ نے فلپ کے جسم پر زخمی حصے پر جس جگہ پر بوسہ دیا تھا اور اُس میں بھی کوڑھ کی بیماری منتقل ہو گئی۔ کیا یہ میڈیکل سائنس کے نقطۂ نظر سے ثابت شدہ حقیقت ہے؟ کیا کوڑھ کی بیماری فزیکلی ٹچ کرنے کی وجہ سے ایک مریض سے دوسرے مریض میں منتقل ہو سکتی ہے؟

سُریندر پرکاش بہت بڑا رائٹر ہے، اُس نے یہاں پر کرسچین ٹچ کس مہارت اور قرینے کے ساتھ دیا ہے، جہاں فلپائن میں کوڑھ کی بستی بنائی گئی ہے تو اسی طرح سے جو لیپروسی ہے جو کوڑھ ہے، وہ حضرت عیسیٰ کو معجزہ عطا کیا گیا تھا کہ وہ کوڑھیوں کو شِفا یاب کرتے تھے۔ وہ کوڑھ کے مریضوں کو ٹھیک کر دیتے تھے۔ وہ بھی کوڑھ کی بستیوں کا دورہ کرتے تھے اور وہاں پر کوڑھ کے مریضوں کو شفا دیتے تھے اور پھر مسیحیت (کرسچینٹی) میں پینکس کا تصور ہے کیوں آپ اپنے کسی جرم پر یا کسی گناہ پر یا کسی غلطی پر نادم ہوں اور اُس کی تلافی کریں۔ یہاں افسانے کی پروٹیگنسٹ جب انگلینڈ جاتی ہے اور کوڑھ کی بیماری کے سبب فلپائن میں وسٹن کے خاندان کے ساتھ ہی قیام پذیر ہوتی ہے تو وہ اپنے گناہ کی تلافی کر رہی ہے۔ یہ کرسچن تصور دیا ہے۔ یہ جیزز کا تصور افسانے کا حصہ بنایا گیا ہے۔ عائشہ کوڑھ کے مریضوں کے ساتھ رہ کر اُن کے ساتھ کام کر کے اپنے گناہ کی تلافی کر رہی ہے۔ ایک لحاظ سے وہ

وہاں پر خود بھی پینس کر رہی ہے۔ وہ اُن پینس میں بھی اُن کو مدد دے رہی ہے۔ پینس کا تصور وِسٹن پر بھی عائد تو ہونا چاہیے، لیکن وہاں پر ایسا کچھ بھی نہیں ہے، وِسٹن اپنے کیے پر کہیں بھی خفت محسوس نہیں کر رہا اور نہ ہی کہیں وہ اپنے کیے پر شدت اور سچائی کے ساتھ نادم ہے جب کہ عائشہ کے یہاں پینس کا احساس عود کر آتا ہے اور یہ بھی ایک اہم عنصر ہے جو اُسے کہانی کا پروٹیگنسٹ بناتا ہے۔ بڑا کردار کون سا ہوتا ہے؟ وہ جو ایک بڑے نیچ پر کھڑا ہو۔ باقی کردار اُس کے مقابلے میں اسی لیے چھوٹے ہوتے ہیں کیوں کہ وہ پروٹیگنسٹ کی نیچ سے بہت فاصلے پر ہوتے ہیں یا اُس نیچ پر کھرے نہیں اُترتے۔ پروٹیگنسٹ اپنے اعمال وافعال میں بڑے کینوس کا حامل کردار ہوتا ہے، جیسا ''اجنبی کہانی'' کا مرکزی کردار عائشہ ہے۔ اُس نے انتقام تو لیا، اپنے محبوب کے قُرب کے احساس سے مجبور ہو کر اور پھر یہ کہ ایک عورت اپنا مرد کسی دوسری عورت کے بانٹتی نہیں ہے۔ وہ نفسیاتی طور پر بانٹ نہیں سکتی، لیکن عورت کی نفسیات میں یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مرد کو، اپنی پہلی محبت کو چھوڑتی بھی نہیں۔ وہ ایک ایسے لمحے کے لیے بھی تیار ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مرد کو دوسری عورت کے ساتھ، اُس کے بچوں کے ساتھ بانٹ بھی لیتی ہے کیوں کہ وہیں پر وہ اپنی محبت کو جانچ لیتی ہے کہ میں اصل میں اُس بندے سے کیا چاہتی ہوں؟ میں اس کا ساتھ چاہتی ہوں اور

یہاں پر تو یہ ہے کہ اُس نے بچے کو نقصان پہنچایا ہے بلکہ پوری فیملی کو نقصان پہنچایا ہے۔ اُس کی پینس کا حصہ ہے کہ وہ اُس کے ساتھ رہے۔ یہ بھی اُس کے لیے ایک طرح کی تکلیف ہی ہے کہ وہ اپنے مرد کو دوسری عورت کے ساتھ دیکھے۔ اُس بندے کی فیملی ہو اُس کے بچوں ہوں، اُن کی طرف التفات کرے۔ یہ بھی ایک لحاظ سے اُس کی سزا ہی ہے۔ عائشہ یہاں ایک کرائسٹ لائیک فگر بن گئی ہے۔ وہ کوڑھ کی بستی میں کسی کہنے پر نہیں گئی، وہ تو اپنی منشا سے کوڑھ کی بستی میں گئی ہے۔ وہ وولنٹیر لی گئی ہے۔ وہاں پر وہ اپنے اعمال وافعال سے کرائسٹ لائیک فگر بن گئی ہے۔ کرائسٹ کس بات کا استعارہ تھا۔ قربانی کا استعارہ تھا، وہ انسانیت کے لیے ایثار اور قربانی کا شدت کے ساتھ احساس رکھنے والا استعارہ تھا۔

گلف ممالک میں پائپ لائنز کا کام تیل کی دریافت کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ 1938 کے لگ بھگ دمام میں تیل نکالا گیا اور اُسی دور میں تیل کی پائپ لائنز پر کام شروع ہو گیا تھا۔ ایران میں بھی اسی دور میں تیل دریافت ہو چکا تھا۔ یوروپین اور امریکی کمپنیوں نے تیل نکالا اور تمام لوازمات پر منصوبہ بندی اور حکمتِ عملی تیار کر کے کام شروع کیا۔ ایران میں کس کمپنی نے تیل نکالا تھا اور تیل کی پائپ لائنز پر کس کمپنی نے کام شروع کیا تھا اور کام کو مکمل بھی کیا تھا، ایران میں 1908 کے لگ بھگ تیل نکالا گیا اور برطانیہ کی کمپنی جس کا نام

"اینگلو پرشیئن" تھا، لیکن کہانی میں یہ سب حادثاتی کہنا چاہیے، یہ کہانی کی جان نہیں ہے۔ یہ ایک ضمنی بات ہے، بنیادی بات یا اہم بات اس لیے بھی نہیں ہے کہ یہ تو ایک ذیلی واقعہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مختلف واقعات کے ذریعے کہانی ارتقا کے مراحل طے کرتی ہے۔ حیل کی پائپ لائنز تو کہانی کو آگے بڑھانے کا ایک منطقی ذریعہ کہا جا سکتا ہے کہ مصنف اپنے متخیلہ کے ذریعے کچھ واقعات اور کچھ ایسے ہی حالات اور صورت حال کی تخلیق کے وسیلے سے معاملات کو آگے بڑھاتا ہے۔

اس افسانے میں حاوی تھیم عورت اور مرد کی محبت ہی ہے اور اُس محبت سے منسلک جو دیگر معاملات ہیں، وہی ہیں، لیکن دوسری تھیم جو اس کے ساتھ جُڑی ہوئی ہے، وہ عورت کی اپروچ اور اُس کا کرنگ کا مقام، جہاں وہ کرائسٹ لائیک فگر بنتی ہے اور جہاں وہ انتقام کی آگ میں جل کر کندن ہو جاتی ہے اور پھر وہ پینس کی طرف آتی ہے۔

پنگل کولونیز کیا تھیں؟ اُن کی ورکنگ کیا ہوتی تھیں؟ لٹریچر میں اُن کو کیسے دکھایا گیا؟ اور پھر کرائسٹ کی لائف کو اسٹڈی کرنا پڑے گا۔

افسانے کے آخر میں عائشہ کا کردار کرائسٹ لائیک فگر یعنی مانند عیسیٰ کئی ایک حوالوں کے ساتھ منظرِ عام پر آتا ہے، جب وہ اپنے دُکھ درد اور مصائب و آلام کو بُھلا کر اپنے کو انسانیت کے لیے وقف کر دیتی ہے، اور جب وہ یہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ وہ کوڑھ کے مریضوں کی خدمت میں اپنی باقی کی زندگی گزار دے گی تو اُس صورت میں پینس کے تصور کا پوری شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے اور اب آخر میں عائشہ وہی کوالٹیز (اوصاف) ظاہر کر رہی ہے جو حضرت عیسیٰ کی کوالٹیز (صفات) تھیں۔ خود کو انسانیت کے لیے وقف کر دینا۔ انسانیت کا استعارہ بن گئی ہے اور انسانیت ہی اُس کے لیے سب کچھ ہے۔

پورا وِسٹن خاندان اب اِس خطرناک مرض میں مبتلا ہو چکا تھا۔ جان وِسٹن کی درخواست پر اُسے، اُس کی بیوی اور اس کے بچوں کو فلپائن کے قریب کوڑھ کے مریضوں کی کالونی میں بھیجنے کا انتظام کیا گیا، لیکن عائشہ کو ایسی کوئی سہولت نہیں دی گئی۔ پھر بھی یہ عجیب اتفاق ہے کہ عائشہ نے وِسٹن خاندان کے ساتھ ایک ہی جہاز پر سفر کیا، لیکن سفر کے دوران وہ بھی ایک دوسرے سے نہ ملے۔ جان اور مارتھا نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے باقی دن اِسی کالونی میں اپنے ساتھی مریضوں کی بھلائی کے کام کرتے ہوئے گزاریں گے۔ عائشہ بھی انھیں کے ساتھ ہے اور یہ سب لوگ اب ایک ساتھ زندگی گزار رہے ہیں! (10)

سُریندر پرکاش کا طرزِ نگارش نہایت فطری ہے اور اُن کے اُسلوب میں دلچسپ، حیران کُن اور گرفت میں لینے والے متعدد عناصر و عوامل دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ سُریندر پرکاش کے کردار نامیاتی صورت حال کے حامل ہیں، اُن کی اپنی اپنی آوازیں ہیں،

خواہ وہ مثبت ہوں یا منفی نوعیت کی حامل ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ کرداروں کی نفسیات اور تقاضوں کے مطابق الفاظ کا استعمال نہایت برمحل اور موقع کی مناسبت سے کرتے ہیں، کہیں بھی وہ الفاظ کا زائد استعمال نہیں کرتے۔ اُن کے افسانہ ''اجنبی کہانی'' میں آنے والے تمام مراحل جن میں کہانی کا آغاز، عروج اور اختتام سبھی عناصر شامل ہیں، مذکورہ عناصر و عوامل قاری کی دلچسپی کو مہمیز عطا کرتے ہیں اور قاری کی ذہنی و فکری حوالے سے نشوونما بھی کرتے ہیں اور اُس کی فکر کو بالیدہ بھی کرتے ہیں۔ سُریندر پرکاش کے معاملے میں کہانی کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ وہ حقیقت سے بھی کام لے سکتے ہیں، وہ اپنے متخیلہ سے بھی کام لیتے ہیں اور اپنے مخصوص اُسلوب سے بھی کام لیتے ہیں۔ اوہ میرے خُدایا! یہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟ اور مجھے ایسا کیوں نہیں سوچنا چاہیے؟ میں مسکراتا رہا اور سوچتا گیا۔ میں نے سوچا کہ یہ میرے ذہن میں سوالات کو جنم دینے والا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ شناخت کے بحران کے لیے کوئی مناسب اور مؤثر جواب بھی فراہم کر سکتا ہے، جس کا بین الاقوامی سطح پر موجودہ انسان کو سامنا ہے یا سامنا ہو سکتا ہے۔ اِس میں کوئی تجویز بھی ہو سکتی ہے۔ اِس میں زندگی کے لُطف و انبساط اور اذیت کا حوالہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ انسانی طاقت کی حدود کو بھی نمایاں اور واضح کر سکتا ہے اور طاقت کے تضادات کو بھی واضح کر سکتا ہے۔ اِس میں سادہ (فلیٹ) اور پیچیدہ (راؤنڈ) کردار بھی ہو سکتے ہیں۔ جذبات و احساسات پر مبنی یا ایک پیچیدہ کہانی بھی ہو سکتی ہے۔ اِس میں کچھ نہ کچھ یقیناً غیر معمولی نوعیت کا حامل ہو سکتا ہے۔ سُریندر پرکاش ہمیں ایک خوشبودار باغ کی طرف لے جا سکتا ہے یا ایک بدبُودار کوڑے کے ڈھیر کی جانب بھی لے جا سکتا ہے جو قاری کو اُس کی گہری نیند سے بیدار کرنے کے لیے اُس کے بند نتھنوں کو بھی کھول سکتا ہے، لیکن جو کچھ بھی ہو۔ میں پھر بھی ''اجنبی کہانی'' کو پڑھنا چاہوں گا جو کسی نہ کسی سطح پر ہم سب کی کہانی ہے۔ ایک تجسس اور کد و کاوش سے بھرپور کہانی موجودہ صورت حال میں ایک وُجود کو مکمل کرنے یا اس کا نامکمل نہ کرنے کی کہانی بھی ہو سکتی ہے۔

سُریندر پرکاش کا افسانہ ''اجنبی کہانی'' اپنے عنوان میں ہی کئی طرح کے بھیدوں کو ملفوف کیے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی ذہن کئی ایک سوالات پر گہرائی و گیرائی کے ساتھ نہ صرف غور و فکر کرتا ہے بلکہ اُس کے سامنے اُس کی شناخت سے منسلک ایک بڑا سوال بھی جواب کا متلاشی و منتظر ہوتا ہے کہ میں کون ہوں؟ میری پہچان کیا ہے؟ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ میرے تعلقات کی نوعیت کس قسم کی حامل ہے؟ اور میں کہاں کھڑا ہوں۔ مشرق اور مغرب کے درمیان کئی ایک حوالوں سے بُعد اور فاصلہ، وغیرہ وغیرہ۔

سُریندر پرکاش نے اپنے افسانہ ''اجنبی کہانی''

میں کئی ایک بڑے موضوعات کو باریک بینی کے ساتھ نہ صرف پیش کیا ہے بلکہ بعض کرداروں کی نفسیات اور پیچیدگیوں کو بھی قاری کے سامنے لا کھڑا کیا ہے اور اُن کے سماجی حالات و واقعات اور صورتِ حال کے تسلسل کے نتیجے میں متعدد سوالات کو بھی اُبھارا ہے جو قاری سے گہرے غور و فکر کا تقاضا کرتے ہیں۔ انسانی نفسیات، انسانی رویوں اور سماجی اقدار سے منسلک سوالات کو بھی قاری کے سامنے رکھا ہے اور انسانی نفسیات سے جُڑے ہوئے متعدد مخفی پہلوؤں کو بھی کہانی کے کرداروں کے توسط سے اُبھارا ہے۔ اگرچہ افسانے کا آغاز تو عورت کی جمالیات سے ہی ہوا ہے اور پھر یہ کہ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے، انسانی زندگی، رویوں اور مختلف کرداروں کی نفسیات کے متعدد پہلو بھی قاری کے ذہن و فکر کے بند گوشوں کو نہ صرف کھولتے ہیں بلکہ قاری کی ذہانت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ بھی کرتے ہیں اور قاری کے ذہن میں کئی ایک سوالات کو بھی جنم دیتے ہیں۔ زیرِ نظر افسانہ ''اجنبی کہانی'' کی پروٹیگنسٹ عائشہ کی خوب صورتی سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے مگر مآل کار وہ اُلجھنوں کے دام میں پھنستی ہی چلی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ اُس کا ایک غلط فیصلہ اُسے مصائب و مسائل کی دلدل میں نہ صرف دھکیل دیتا ہے بلکہ اُسے زندگی راستہ ہی نہیں دیتی۔ اب یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسان منتقم مزاجی کے رویے کو کب اور کس طرح کی صورتِ حال میں اپنی نفسیات کا جُزو لاینفک بنانا شروع کرتا ہے۔ اِس سوال کا جواب افسانے کی پروٹیگنسٹ عائشہ کی زندگی سے منسلک صورتِ حال اور حالات و واقعات سے ہی آشکار ہوجاتا ہے۔ افسانہ نگار نے کہانی کے آغاز میں ہی ایک طرف تو کہانی کی پروٹیگنسٹ کی خوب صورتی کو آئینہ کیا ہے تو ساتھ ہی اپنی منزلِ مقصود یعنی اپنی محبت کو پانے کی للک میں اُس کی منتقم مزاجی اور انتقام کی نفسیات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے، لیکن کوئی بھی خوف ناک اور بھیانک صورتِ حال علت و معلول کے رشتے کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ کہانی کے آغاز میں ہی کہانی کی پروٹیگنسٹ کو ذہنی و فکری سطح پر معمول کی زندگی گزارنے والی عورتوں سے جداگانہ طریق کی حامل ظاہر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عائشہ کی کہانی کو ایک افسانے جیسی چیز کے ساتھ بھی تعبیر کیا گیا ہے اور ساتھ پیراڈوکس کی تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے، کہانی کو ایک اور کردار ڈاکٹر جارج ساوا کی یادداشتوں اور ذاتی تجربات کے نتیجے کے طور پر آگے بڑھایا گیا ہے اور پروٹیگنسٹ کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کو ایک خوف ناک حقیقت سے بھی تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں فکشن نگار کے متخیلہ کی معجز نگاری کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، وہ اِس لیے کہ افسانہ نگار معمول کے کہانی کار تو ہیں نہیں۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ فکشن رائٹر کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے ایک اور کردار تخلیق کرتے ہیں اور اُس کردار کا نہایت اختصار کے ساتھ تعارف کرواتے ہوئے، کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں اور اپنے قاری کو کئی ایک لحاظ سے انسانی ثقافتوں اور تاریخ کی غواصی بھی کرواتے ہیں اور یورپ کی تاریخی اور سماجی صورت حال بھی قاری کے سامنے رکھتے ہیں۔ زار کی بادشاہت اور اُس عہد کی جبریت کو بھی قاری کے سامنے بغیر کسی کمنٹ کے رکھتے ہیں اور روس کے آخری بادشاہ زار کا کس طریقے کے ساتھ اشتراکیت پسندوں نے دھڑن تختہ کیا تھا اور زار کی سپاہ سے منسلک ڈاکٹر جارج ساوا کس طریقے سے روس کو خیر باد کہہ کر یورپ کے متعدد دیگر ممالک کی خاک چھانتے ہوئے، آخرِ کار انگلینڈ کو اپنا مستقل مستقر بناتے ہیں اور تقدیر کی مہربانی سے فرانس، جرمنی، اٹلی اور پھر بعد میں دوسری عالمی جنگ کے بعد کے دور تک برطانیہ ہی میں اپنے طبی فرائض انجام دیتے ہیں اور ناقابلِ علاج بیماریوں کے بھی علاج کے لیے تگ و دو کرتے ہیں اور پھر اُن کی زنبیل سے وسٹن جیسا کردار بھی برآمد ہوتا ہے جو مشرقِ وسطیٰ کے کئی ممالک کی خاک چھاننے کے بعد واپس انگلینڈ پہنچتا ہے اور پھر ایک بار پھر سے اُس کا سامنا افسانے کی پروٹیگنسٹ عائشہ کے ساتھ ہوتا ہے۔

کہانی بہت ہی سادہ پلاٹ کی حامل نہیں ہے بلکہ پیچیدہ پلاٹ کی عکاسی کرتی ہوئی کہانی ہے، جس کی سیٹنگ میں مشرق اور مغرب دونوں خطے اور دونوں کے کرداروں کی نفسیات اور انسانی رویے سے قاری کا سابقہ پڑتا ہے، کچھ اس طرح کا پیش منظر و پس منظر ہے اور اس کے بعد کہانی ایک مرد کردار وسٹن کے ذریعے آگے بڑھتی ہے جو انگلینڈ کا باشندہ ہے اور تیل کی پائپ لائنز کے کام کے سلسلے میں مشرقِ وسطیٰ میں کام کر رہا ہے اور اُس کردار کا نام جون وسٹن ہے۔ اُس کے اور ایک اور نیٹل لڑکی جو وسٹن سے محبت کرتی ہے، جس کا نام عائشہ ہے، اُس کے توسط سے کہانی آگے بڑھتی ہے اور انسانی نفسیات اور انسانی رویوں اور سوچ کی متعدد پیچیدگیوں اور اُلجھاووں کو آئینہ کرتی چلی جاتی ہے، جہاں الم ناک صورتِ حال نقطۂ اختتام کی جانب لے اپنے قاری کی اُنگلی پکڑ کر اُسے ایک عجیب و غریب بلیک ہول کی جانب لے جاتی ہے اور آخرِ کار مشرق اور مغرب کی فکری آویزش کے بعد کہانی میں آخری موڑ اُس وقت آتا ہے، جب عورت کی نفسیات کی سُوجھ بُوجھ کے حوالے سے ایک نہایت اہم سوال پیدا کیا گیا ہے کہ عورت کی نفسیات کو کون سمجھا ہے۔ نفسیات کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو عورت کا تعلق دُنیا کے خواہ کسی بھی خطے سے ہو! اُس کا اپنا ہی ایک نفسیاتی نظام ہے، جس کی بہر حال ایک مسلمہ اہمیت بھی ہے اور حیثیت بھی ہے، لیکن آخری نتیجے کے طور پر عورت کی نفسیات سے کون انکار کر سکتا ہے!

☆☆☆☆☆

ردِعمل ''ایک جائزہ''

ہماری مشرقی تنقید شاعر کو پیش نظر رکھتی ہے اور اس کے ذاتی زندگی کے حالات و واقعات اور اس پہ گزرنے والے مصائب کو سامنے رکھ کر شاعری کا تجزیہ کرتی ہے۔ اسی طرح ہم نے میر کو پڑھا، غالب کو پڑھا اور دوسرے کلاسیکی شعرا کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ لیا۔ مغربی تنقید نے ہمیں یہ سکھایا کہ شاعر کو منہا کر کے اس کی تخلیق کا جائزہ لینا چاہیے کیونکہ شاعری تو ہر زمانے کے لیے ہوتی ہے اور اس کا ایفیکٹ بھی ہر زمانے پہ ہوتا ہے اس لیے شاعر کو منہا کر کے اس کی تخلیق کے تنقیدی جائزے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ اس تناظر میں جب ہم شعر کو دیکھتے ہیں تو اس کی دو پرتیں نظر آتی ہیں ایک تو اس کا ظاہری خیال ہے کہ جس کو لفظوں میں پینٹ کیا جاتا ہے، ایک خیال کی زیریں سطح ہوتی ہے جس کا تعلق اس سماج سے، حالات سے یا اس عہد سے ہوتا ہے۔ اکمل حنیف کی شاعری کو میں نے اسی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے ان کی شاعری کا مرکز و محور رشتے اور گھریلو زندگی ہے وہ روایات سے جڑے ہوئے انسان ہیں، پُرکھوں کے نقش قدم پہ چلنے کے خواہ ہیں اور موجودہ عہد کی نفسا نفسی سے خائف نظر آتے ہیں۔ اب میں آپ کے سامنے گھر کے حوالے سے چند شعر رکھتا ہوں۔ غالب کا شعر سنیے:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

جدید شاعر ناصر کاظمی کہتے ہیں:

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھلے سو رہی ہے

اعجاز کنور راجہ کا شعر ہے:

کوئی دریچہ ہوا کے رخ پر نہیں بنایا
مرے بزرگوں نے سوچ کر گھر نہیں بنایا

.....

میں نے چند شعر آپ کے سامنے رکھے ہیں:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

.....

آپ دیکھیے کہ اس شعر کو جب 1857 کے پس منظر میں دیکھتے ہیں تو اس کے سارے معنی بدل جاتے ہیں۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

.....

جب اس شعر کو آپ سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو اس کی نئی معنویت جنم لیتی ہے۔ اس طرح

شاہد اشرف

''مرے بزرگوں نے سوچ کر گھر نہیں بنایا'' جب آپ 1947 کے پس منظر میں دیکھتے ہیں تو اس کے نئے رنگ یا نئے شیڈ واضح ہوتے ہیں، ہماری ساری شاعری دو سطحوں پہ ہوتی ہے ایک اس کی ظاہری سطح ہے اور ایک اس کے اندر خیال کی زیریں رو بہہ رہی ہوتی ہے جس سے اس کی ڈائمنشن کا پتہ چلتا ہے۔ اکمل حنیف کی شاعری کا جو مرکز و محور ہے وہ گھر ہے اور اس کا عہد ہے اور گھر سے جڑے ہوئے رشتے ناتے ہیں، اس کے ساتھ جڑے ہوئے معاملات ہیں۔ میں نے ان کے شعروں کا انتخاب کرتے ہوئے گھر اور اس سے جڑے ہوئے معاملات کو پیش نظر رکھا ہے مثلاً آپ دو تین شعر سنیے اور حیران رہ جایئے کہ وہ کس طرح سے اپنے عہد کو پینٹ کرتے ہیں:

کر چکے باپ کی تدفین ملازم گھر کے
سوچتے رہ گئے پردیس سے آنے والے

.....

یہ کس قدر سچائی ہے کہ جو اس عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کیفیت کو اکمل حنیف نے بیان کیا ہے۔ عبداللہ حسین کے جنازے میں کل نو افراد شریک تھے۔ وہ اُردو ادب کا باکمال ناول نگار تھا۔ اس نے ''اداس نسلیں'' جیسا شہکار اور عمدہ ناول دیا۔ مستنصر حسین اس کے تدفین کے وقت سرہانے بیٹھے ہوئے تھے اور دعا مانگنے کے بعد صرف گھر کے ملازم اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ اس کے بیٹے بیرون ملک مقیم تھے اور جنازے میں شریک ہونے سے معذور تھے۔ ایدھی صاحب سے کسی نے پوچھا کہ کوئی ایک ایسا واقعہ ہے جسے آپ کبھی بھول نہیں پائے۔ انھوں نے کہا کہ ایک دن ایک نوجوان ایک ایمبولینس میں میت لے کے آیا اور اس نے کچھ ہزار روپے ہمیں دیے اور کہا کہ اس کی تدفین کر دی جائے۔ ہم نے کہا جی کر دیتے ہیں۔ اس سے پوچھا کہ آپ کون ہیں اس نے کہا کہ میں اس کا بیٹا ہوں اور میری فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے میرے پاس صرف دو گھنٹے باقی ہیں میں اس تدفین میں شامل نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتے ہیں اُس وقت پہلی بار کسی کو دفناتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ یہ ہمارا عہد ہے اور اس عہد کی سچائیاں ہیں کہ جن کو فراموش نہیں کر سکتے۔ اکمل حنیف ہمیں ایسی سچائیوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں اب دیکھیے:

آنے والوں کے لیے پیڑ اُگاتے جائیں
ہم ہیں پُرکھوں کی روایات نبھانے والے

.....

دیکھیے اگر آپ روایت کو ساتھ لے کر نہیں چلتے تو آپ ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں آپ کے قدم کہیں نہ کہیں زمین پہ رہنے چاہیے آپ بے شک جتنے جدید یا ماڈرن ہو جائیں لیکن وہ ایک تعلق جو آپ کا اپنے کلچر سے، اپنی روایات سے، اپنی تہذیب سے یا تمدن سے ہے، اس کا ٹوٹنا آپ کے لیے ازحد نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ اس کے اثرات زندگی پہ بہت منفی ہوتے ہیں۔ اسی طرح دیکھیے:

میں پُرکھوں کا زمانہ چاہتا ہوں
وہی بچپن سہانا چاہتا ہوں

واہ، کیا خوبصورت بات ہے۔

گھر میں احساس جب گھٹن کا ہوا
ایک پنچھی اڑا دیا میں نے

.....

ماں باپ کی نشانی تھا کل تک جو ایک گھر
بچوں نے بیچ ڈالا ہے حصے نکال کے

.....

باپ جیسا لگا مجھے اکمل
جب بھی اُس پیڑ سے ملا ہوں

جو شجر شان حویلی کی ہوا کرتا تھا
کاٹ ڈالا اُسے تعمیر عمارت کر کے

.....

یہ کچھ اشعار ایسے تھے جو میں نے بطور خاص ان کی کتاب سے اخذ کیے ہیں۔ میں ان کے لب ولہجہ، ان کے اسلوب، ان کی ڈکشن، خیال کی تزئین اور لفظوں کی ترتیب سے متاثر ہوا ہوں۔ ہمارا جدید شاعر ایسا ہی ہونا چاہیے وہ اپنے عصر سے جڑا ہوا نظر آئے اور اس کی تخلیقات میں اس کا زمانہ بولتا ہوا دکھائی دے اگر کوئی موسیقار دھن بناتے ہوئے اپنے عصر کی دھن کو نظر انداز کر دیتا ہے، کوئی تصویر بناتے ہوئے اپنے زمانے کے سارے رنگ و پیرہن اور خال وخد کو فراموش کر دیتا ہے تو ہمارے سامنے ایک ایسی تصویر بنتی ہے جو اس زمانے کی نہیں ہے، نہ اس سے اگلے زمانے کی ہے۔ یعنی شاعری میں شاعر کا زمانہ، اس کا عہد کسی نہ کسی طرح سانس لیتا ہوا نظر آئے۔ اکمل حنیف کی شاعری میں اس کا زمانہ سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے موضوعات اور بہت عمدہ اور شاندار ہیں مثلاً:

لوگ پتھر سمجھ رہے تھے مجھے
اس لیے ٹوٹنا پڑا مجھ کو

.....

بھئی کیا عمدہ شعر ہے یقین جانیے یہ شعر پڑھ کر مجھے افضل خان کا وہ شعر بھی یاد آیا۔

اب جو پتھر ہے آدمی تھا کبھی
اس کو کہتے ہیں انتظار میاں

.....

یہ شعر اسی پائے کا ہے اور اس میں وہی رنگ اور وہی شکوہ دکھائی دیتا ہے جو افضل خان کے شعر میں ہے۔ چند شعر اور دیکھیے:

تو مجھے چھوڑ جائے گا اک دن
تیرا لہجہ بتا رہا ہے مجھے

.....

اپنے سائے سے جب ہوئی وحشت
ہم دیے کو بجھا کے بیٹھ گئے

.....

یاد آئی ہے رفتگاں کی مجھے
اپنی آنکھوں سے بہہ رہا ہوں میں

.....

آخری شعر کو اعزہ واقارب تک محدود نہیں کیا جا سکتا ہے۔ رفتگاں کے لفظ میں ہماری ثقافت، اقدار اور روایات بھی شامل ہیں۔ جن کی موت پر شاعر آنسو بہا رہا ہے۔

خونی رشتے بہت عجیب ہوتے ہیں۔ میں نے کہیں ذکر کیا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک دنیا سے چلے جائے تو اس کے بعد زندگی نارمل نہیں رہتی۔ یہ وہی جانتا ہے جو اس کرب سے گزرا ہے۔ بہن بھائیوں اور والدین میں سے کوئی ایک دنیا سے چلا جائے تو اس کے بعد آپ کی زندگی نارمل نہیں ہوتی۔ پہلے جیسی نہیں ہوتی جو ان کی موجودگی میں ہوتی ہے۔

اس اچھی، عمدہ اور خوبصورت کتاب پہ اکمل حنیف کو بہت مبارک، یقین جانیے کہ فیس بک پہ جیسی شاعری ہو رہی ہے، جس طرح لوگ لکھ رہے ہیں اور دھڑا دھڑ کتابیں آ رہی ہیں۔ میں ان کتابوں کو دیکھ کر بڑے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ ان شعرا کا شعری سفر جہاں پہ ختم ہوتا ہے اکمل حنیف نے وہاں سے اپنے سفر کا آغاز کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

اعجاز رضوی منفرد شاعر اور باکمال شخصیت

کہاں کہاں سے زمین کھودوں
کہاں کہاں سے فلک کریدوں
کہاں کہاں سے پہاڑ کاٹوں
کہاں سے دریا کے رُخ کو موڑوں
کہاں سمندر کی راہ روکوں
کہاں سے صحرا کو راستہ دوں

مجھے بتایا، مجھے بتانا، کہاں چھپا ہے مرا ستارا، مجھے بتانا
مرے ستارے کی رہگزر میں، نشیب کیوں ہے، مجھے بتانا
مرے ستارے کے اپنے گھر میں، فریب کیوں ہے

.....

اتنا خوبصورت اور اچھوتا کلام کسی اور کا نہیں ہے بلکہ ہمارے دلوں کے قریب بلکہ دلوں کے اندر بسنے والے اور دھڑکنے والے شاعر ادیب اور دانشور اعجاز رضوی کا ہے، جس کو سن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ لفظوں کی جادوگری کسے کہتے ہیں اور الفاظ کے جادو سے دلوں میں اُترنا بلکہ سما جانا اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔

اعجاز رضوی ایک ایسی سحر انگیز شخصیت ہیں جن سے آپ کی شناسائی اور دوستی آج کل کے متعصب اور گھٹن زردہ ماحول میں کسی نعمت غیر مترکبہ اور بادِ صبا کے جھونکے سے ہرگز کم نہیں ہے اعجاز رضوی ایسی باغ و بہار ہستی کے مالک ہیں کہ ان کی طرف سے آپ کو صرف ٹھنڈی اور خوشبودار مہکتی ہوئی ہوائیں ہی آسکتی ہیں۔ یہ کدورت، تنگ نظری اور بغض و کینہ جیسی خصوصیات سے قطعاً عاری ہیں اور ان جُملہ اوصاف سے کوسوں دُور ہی رہنا پسند کرتے ہیں یہ انتہائی شفیق اور ملنسار انسان ہیں عاجزی انکساری اور بردباری ان کی شخصیت کا خاصہ ہے لیکن یہ اپنی خودداری پر بھی کوئی سمجھوتہ کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ یہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز و ممیّز نظر آتے ہیں۔ اعجاز رضوی ایک صاحبِ خیال و نظریہ بلند پایہ شاعر، بے مثال خاکہ نگار، منفرد سکرپٹ رائٹر اور کمال کے اینکر پرسن ہیں۔ ان کی ہر صنفِ ادب پر گرفت ان کی ادب سے لگن فنی مہارت اور سنجیدگی کی غمّاز ہے۔ یہ حقیقی طور پر اپنے تن من اور دھن سے پچھلی کئی دہائیوں سے شعر و ادب کی خدمت کے لیے کوشاں ہیں چاہے ''فنون'' میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا ساتھ ہو یا حلقہ ارباب ذوق میں شعر و ادب کے لیے اُن کی کاوشیں ہوں ہر جگہ پر ان کا کردار واضح اور شفاف نظر آتا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق میں جوائنٹ سیکرٹری سے لے کر حلقہ کی

فیصل زمان چشتی

آئینی صدارت تک کے سفر میں ہر جگہ پر وہ پوری دیانت داری اور پورے قد کے ساتھ ہمیشہ کھڑے رہے اور ڈٹے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی حلقوں میں ان کا نام نہایت عزت و تکریم کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ اصول پرست آدمی ہیں جس پر وہ ذرا بھی لچک نہیں دکھاتے۔ منافقت سے اُن کا دور سے بھی واسطہ نہیں ہے۔ انھوں نے ہمیشہ سچ اور حق کا ساتھ دیا اور کبھی مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا۔ اپنے موقف کو بیان کرنے میں یہ کبھی نہیں گھبراتے اور بلا خوف و خطر نہایت جرأت اور دلیری سے بات کر جاتے ہیں آج کل کے دور میں یہ ہمت و استقلال ہر شخص کے نصیب میں نہیں اور خاص و عام میں یہ خصوصیات ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ اعجاز رضوی انتہائی حساس اور خوبصورت شاعر ہیں۔ حمد، نعت، غزل، منقبت اور نظم غرضیکہ ہر صنف ادب میں شاعری کرتے ہیں اور کمال کرتے ہیں۔ نظم ان کا خاص میدان ہے اور یہ اس میدان کے شہسوار ہیں۔ ان کی نظمیں کسی بھی معیار پر رکھی جا سکتی ہیں ان کی نظموں میں ایک خاص کیفیت اور سرشاری ہوتی ہے یہ نظم برائے نظم نہیں کہتے بلکہ یہ نظم برائے زندگی کہتے ہیں ان کی نظم کی پنچ لائن اتنی خوبصورت اور دل میں اُترنے والی ہوتی ہے کہ قاری بڑی دیر تک اس کے سحر سے نکل نہیں پاتا۔ یہ حقیقت میں جدید تر شاعر ہیں ان کی شاعری سُن کر شاعری کو کار زیاں سمجھنے والا بھی شاعری پر ایمان لے آتا ہے اور یہی ان کی شاعری کا معجزہ ہے اور کامیابی ہے ان کی ایک چھوٹی سی نظم ملاحظہ کیجیے تا کہ میرے دعوے کی آپ بھی تصدیق کر سکیں۔

سنو! جلدی کرو! زادِ سفر باندھو
زمیں کا آخری چکر مکمل ہونے والا ہے
زمیں تھک ہار کے اب بیٹھ جائے گی
ہمیں اگلے زمانے کے کسی اگلی کہانی میں
نئے کردار کرنے ہیں! نئے بہروپ بھرنے
ہیں! سنو جلدی کرو! زمیں کا آخری
چکر مکمل ہونے والا ہے

اعجاز رضوی نظم میں بات کرتے ہوئے کبھی دیومالائی کہانیوں اور طلسماتی کرداروں کا سہارا نہیں لیتے نا ہی مشکل الفاظ سے قاری پر رعب ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ نہایت خلوص و سادگی اور سہل پسندی سے کام لیتے ہوئے خوبصورت تشبیہات و استعارات اور چمکتی ہوئی تلمیحات کے ساتھ قاری کو اپنی بات اتنی عمدگی سے سمجھاتے ہیں کہ وہ ان کی شاعری کے طلسم کے حصار میں جکڑا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں وہ ان دیکھا کرشماتی جہان ہے جہاں کوئی جب داخل ہوتا ہے تو اس کا دل اس سے واپس آنے کو نہیں چاہتا یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان سے شاعری سنتے ہیں تو سنتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ایک اور نظم دیکھیے اور سر دھنیے:

مری ہتھیلی پہ ہجر و وصال خاک ہوئے
میں اُن کی خاک اُڑا دوں کہ اپنے منہ پہ ملوں
کسی طرف سے اشارا کوئی نہیں ملتا

کوئی بھی آنکھ مجھے غور سے نہیں تکتی
کوئی بھی دل میری خاطر یہاں دھڑکتا نہیں
یہاں تو شہر کی ترتیب ہی نرالی ہے
جو لوگ ہجر فروشی میں تاک تھے پہلے
وہ لوگ وصل کی اجرک اُٹھائے پھرتے ہیں
میں اُن سے وصل خریدوں یا ہجر کی ماچس
مرے لیے تو برابر ہے یہ خریداری
عجیب رنگ پہ آئی ہے گرم بازاری
کوئی بھی پھر یا کسی اور کی نہیں سنتا
بس اپنے مال کی تعریف کرتا جاتا ہے
میں دل شکستہ کھڑا چاروں سمت دیکھتا ہوں
کسی طرف سے اشارا کوئی نہیں ملتا
میں سر بہ زانو پڑا بڑبڑاتا رہتا ہوں
مجھے یہ گریۂ بازار مار جائے گی
مجھے یہ تاجری گفتار مار جائے گی

.....

اعجاز رضوی پی ٹی وی سمیت پاکستان کے بڑے چینلز کے سکرپٹ رائٹر ہیں اور کئی معروف پروگرامز کو اپنے زورِ قلم سے کامیابی کے سہرے بندھوا چکے ہیں ان کی ادبی اور فنی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اعجاز رضوی عرصۂ دراز سے عہدِ حاضر کے سب سے موقر ادبی جریدے ماہنامہ بیاض، لاہور سے منسلک ہیں۔ اور وہاں پر بھی اپنا کلیدی رول ادا کر رہے ہیں۔ اور یہ ماہنامہ ادبی دنیا میں اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ شعر و ادب کے لیے اس جریدے کی خدمات قابلِ تحسین نا قابلِ فراموش ہیں۔ اگر کسی ایونٹ یا مشاعرے کی نظامت اعجاز رضوی کر رہے ہوں تو ان کا نام ہی اس پروگرام کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان کے فی البدیہہ اور خوبصورت بے ساختہ رنگ دار اور برمحل جملے محفل کا رنگ جمانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔

اعجاز رضوی انتہائی اعلیٰ پائے کے خاکہ نگار ہیں اور ان کا شمار عہدِ موجود کے اہم ترین خاکہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ خاکہ لکھنا انتہائی اہم اور حساس صنفِ ادب ہے اس میں لوگوں کے ناراض ہونے کا خطرہ بھی دامن گیر رہتا ہے۔ نظم کے ساتھ ساتھ ان کی نثر میں بھی بلا کی کاٹ اور تاثیر ہے ان کے الفاظ اور فقرات انتہائی خوبصورت اور نپے تلے ہوتے ہیں ان میں اپنائیت کی چاشنی اور محبت کی حلاوت ہوتی ہے جس سے وہ کردار کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ قاری دم بخود رہ جاتا ہے۔ یہ کسی کردار کے منفی پہلو کو اس طرح اُجاگر کرتے ہیں کہ وہ خوبی نظر آنے لگتی ہے۔

اعجاز رضوی چھ عدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں چار شاعری کی اور دو خاکہ نگاری کی ہیں، جن میں سفر واجب ہوا، بہت سے دکھ ہیں، خوف اور اُداسی کی نظمیں یہ مجھ سے کون بچھڑا ہے شاعری کلوزاپ اور بندہ بشر خاکوں پر مشتمل ہیں۔

ان کی پوری زندگی دنیائے ادب کے نامور اور مقبول ترین لوگوں کے ساتھ گزری ہے مگر کبھی بھی اپنی ذات کے فائدے کے لیے نہ کسی کو کہا اور نہ کبھی کوئی نام استعمال کیا۔ یہ نمود و نمائش، ذاتی تشہیر اور سستی شہرت کے حصول کے قائل نہیں ہے بلکہ مسلسل اور انتھک محنت ہی ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

ایک سچا اور کھرا شاعر ہمیشہ حساس اور دردمند دل رکھنے والا ہوتا ہے۔ وہ ناہموار معاشرتی رویوں اور اردگرد پھیلنے والی بے چینی سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ وہ ہر ناانصافی ظلم اور جبر پر نعرۂ حق بلند کرتا ہے۔ ایک جینوئن شاعر اپنے عہد کی تاریخ بھی مرتب کر رہا ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ سچ لکھتا ہے اسی طرح اعجاز رضوی بھی اپنے اردگرد کے ماحول اور معاشرے سے بخوبی آگاہ ہیں اور ان کی قوت مشاہدہ بھی کمال کی ہے۔ یہ سیاسی اور سماجی حالات کو شعری قالب میں ڈھالتے نظر آتے ہیں کیونکہ معاشرہ سے تعلق اور جڑت ان کی شاعری کو آفاقی اور لازوال بناتی ہے۔ اسی طرح کے جذبات اور کیفیات سے مزین یہ نظم دیکھیے:

میرے دفاع کے سب منصوبے سارے نقشے
اب میرے اپنے سردار کے قبضے میں ہیں
اور میری تلوار کا دستہ ٹوٹ گیا ہے
میرے ترکش میں جتنے بھی تیر رکھے ہیں
اُن پر میری ماں کی چادر جھول رہی ہے
میری کماں پر اک تنکے کو تیر بنا کر
میرے قبیلے کے سب گھبرو چور سپاہی کھیل رہے ہیں
چند اک بچے اپنے بابو کے کہنے پر مجھکو پاگل پاگل
کہہ کر چھیڑ رہے ہیں
تم سے میری اک درخواست ہے اے سردار
اپنے باج گزاروں میں اب میرا نام بھی لکھ لو

.....

کتنی خوبصورتی اور فنی مہارت سے اعجاز رضوی نے موجودہ سسٹم کے کرداروں کو بے نقاب کیا ہے اور شاعری کے دبیز پردوں میں ہمارے معاشرے کو پوری کہانی قلمبند کر دی ہے اور زندہ معاشروں میں سچے فنکار کا یہی رول ہوتا ہے جو اعجاز رضوی بطریق احسن نبھا رہے ہیں:

اعجاز رضوی لفظوں کو اُجالنے اور نکھارنے کے فن میں طاق ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ ہمیشہ نئے راستے اور نئے نئے امکانات ڈھونڈتے نظر آتے ہیں یہ مسلسل ریاضت اور انتھک محنت و جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں یہ اپنا کام پوری دیانت داری سے جاری رکھے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کا کام بھی زندہ اور نام بھی چمک رہا ہے یہ آئندگان میں بھی اپنے فکر و فن کی بدولت زندہ و پائندہ رہیں گے۔ آخر میں ان کے کچھ اشعار دیکھیے:

خوابوں کے انبار اُٹھائے پھرتا ہوں
کاندھوں پہ گھر بار اُٹھائے پھرتا ہوں
ایک پرندے کی خاطر میں صدیوں سے
شانوں پہ اشجار اُٹھائے پھرتا ہوں
بچپن میں اک کاغذی کشتی کیا ڈوبی
میں اب تک پتوار اُٹھائے پھرتا ہوں

.....

گزر گاہوں پہ سناٹا ہوا ہے
کہ میرا دل ہی سُونا ہوا ہے
جو میری آنکھ سے ٹپکا نہ برسوں
وہ آنسو پھیل کر دریا ہوا ہے

.....

ضروری تو نہیں رسوائیاں ہوں
محبت آبرو بھی چاہتی ہے

.....

میرے سامنے آب و ہوا کا دریا ہے
اس پر کیسے پُل تعمیر کیا جائے

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر طلعت شبیر اور الگ راستوں کا دکھ

اردو ادب میں افسانوی مجموعے ''جنگل جنگل الجھے ہم'' کے خالق اور شعری مجموعے ''سلسلے مسافت کے'' قلم کار ڈاکٹر طلعت شبیر افسانوی ادب اور شعری تجربات کی بنا پر داد، تحسین، آفرین اور مبارکبادیاں حاصل کر چکے ہیں اور اب انھوں نے ''الگ راستوں کا دُکھ'' جو کہ غزلوں، نظموں اور نثری نظموں کا معنوی خزانہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے قارئین، ناقدین، محققین اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے پیش کیا ہے۔ حسبِ سابق اور حسبِ روایت یہاں بھی بطور شاعر ڈاکٹر طلعت شبیر کو حد سے زیادہ پزیرائی حاصل ہوئی ہے۔ جو دلیل ہے اس امر کی کہ ان کا شعری سفر افسانوی سفر کی طرح حسن کاری کی کچھ الگ دنیاؤں کا اک جیتا جاگتا حوالہ ہے، جو اپنے اندر دائمیت اور بقا کے بے شمار دلآویز رنگ سمیٹے ہوئے ہے۔ شعری سرمائے میں اضافے کا یہ استقلال چراغ سے چراغ جلا کر شاہراہ شعر و نظم کو روشن سے روشن تر کرنے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر طلعت شبیر کے قلم کی روانی اور بیان کی جولانی ان کی بحیثیت شاعر دنیائے شعر و ادب میں اک اضافے کی موجب تو ہوئی ہی ہے، مگر ڈاکٹر موصوف کی بدولت شعری سرمائے میں موضوع کی وسعت، خیال کی رعنائی، معنویت کی دلکشی، فکر کی جاذبیت اور فنی گہرائی کی وجہ سے جو اضافے ہوئے ہیں وہ تحسین کے لائق بھی ہیں اور حوصلہ افزا حد تک اس خیال کو تقویت دے رہے ہیں کہ چراغ نظم و شمع غزل روشن تھی روشن ہے اور روشن رہے گی۔

بڑے سہمے ہوئے پھرتے ہیں محبت کے امیں
دیکھنا پیار کی نظروں سے بھی ڈر جاتے ہیں

.....

میرے لیے ڈاکٹر طلعت شبیر کے شعری تعارف کا ابتدائی حوالہ ''بیاض'' ثابت ہوا۔ جہاں قارئین اور ناقدین نے ان کی غزلوں کو پڑھا، نظموں کو دیکھا، پسند کیا، سراہا اور اِس شاعر سے متعارف ہوئے اور ان کے کلام کے مجموعی تاثر کو دیکھنے کا ارمان دل میں موجزن ہونے لگا۔ ڈاکٹر طلعت شبیر نے اپنی شعری ریاضت (اگرچہ یہاں وہ ایک سچے خالق کے طور پر ابھی اس فنی و فکری ریاضت کو ناتمام سمجھتے ہیں) کی بدولت پہلے ''سلسلے مسافت کے'' اور اس کے صرف چار برس بعد ''الگ راستوں کا دکھ'' کے ذریعے

راحیلہ خورشید

اپنے چاہنے اور سراہنے والوں کے لیے اپنی شاعری کو مطالعہ اور نقد و تبصرہ کے لیے پیش کیا۔ فرد اپنے احساسات کی ترجمانی چاہتا ہے، وہ اپنی ذات کی نہاں پرتوں کو اظہار کے پلیٹ فارم پر لانا چاہتا ہے۔ حساس طبع افراد کے لیے اظہاریے کی ترجمانی اور بھی زیادہ ضروری ہے اور پھر وہ آپ بیتی جس میں جگ بیتی کے بے شمار نہاں پہلو ہوں ان کا ابلاغ اور اظہار تو اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے اور ڈاکٹر طلعت شبیر نے اپنے حساس رویوں، باطن کے مشاہدات، جذبات کی نفسیات اور شعور میں جگہ پا لینے والے خیالات کو اپنی غزلوں میں فنکارانہ حسن کا مظہر بنا کر سمیٹا ہے۔ غزلوں کے ذریعے اپنے داخلی جذبات اور نظموں کے ذریعے نفسیاتی شواہد کو بیان کرنے کی سعی میں وہ ایسے فن پارے پیش کرنے کے قابل ہوئے ہیں کہ کہیں ان کا جدت پسند انداز روایت سے آمیزش کرتا دکھائی دیتا ہے اور کہیں روایت اور جدت کا امتزاج کلام کے دروبست کو اساتذانہ مہارت و مقام سے قریب تر کر دیتا ہے۔ جسے ڈاکٹر طلعت شبیر نے مثبت اور منفی رویوں کے تزکیے کا نام دیا ہے۔ اس کا مطالعہ ہر قاری کے لیے کتھارسس کا بڑا ذریعہ بن جاتا ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے احساسات اور جذبات کو کمال مہارت سے اشعار کا قالب دے کر اطمینان قلب کا پر لطف احساس حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن اصل مہارت اور کاملیت تو تب حاصل ہوتی ہے جب شاعر کا اظہاریہ اس کے قاری کے لیے تزکیے اور حظ کا ذریعہ بن جائے اور ڈاکٹر طلعت شبیر کامیاب حد تک اپنے قاری کو ساتھ ساتھ رکھنے اور کتھارسس میں مدد فراہم کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

ڈاکٹر طلعت شبیر کو موضوعات کی تلاش میں جسارت، جستجو اور جد و جہد ہرگز نہیں کرنی پڑی۔ ان کا مشاہداتی احساس، بہت روشن، تیز ترین اور گہرائی تک کی نظر رکھنے والا ایک لامتناہی قوت کا خزینہ ہے وہ اشیا کے داخل میں جھانک سکتے ہیں۔ باطن کا نظارہ ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے نہاں خانوں سے پوشیدہ موضوعات کو کھینچ لاتے ہیں اور فنکارانہ اپج سے حسن کاری کے زیور سے آراستہ کر کے قاری کے سامنے سجا کر رکھ دیتے ہیں اور پڑھنے کے لیے یہ موضوعات ہرگز نامانوس، نئے اور اجنبی نہیں دکھائی دیتے۔ یوں موضوعات کی رنگا رنگی نے تنوع کی ایک ایسی فضا ہموار کر رکھی ہے کہ جس میں زندگی کے ہر دو متضاد رنگ اپنی مکمل رعنائی اور آہنگ سا سموئے ہوئے ہیں۔

جب ڈھلی شام تری یاد کے جگنو چمکے
پھر چراغوں کو یونہی طاق میں مرجانا تھا
وہ مرا ساتھ بھی دیتا تو کہاں تک دیتا
چاند کو جھیل کے اس پار اتر جانا تھا

ان کے پاس سچ کی پاسداری بھی ہے اور جھوٹ کا ماتم بھی۔ ڈاکٹر صاحب منافقت کا رونا بھی رو رہے ہیں اور اخلاص کے جذبات پر شادماں بھی ہیں۔ قانون فطرت میں خوشیاں، محبت، آسانی، صحت اور امید کا اظہار کرتے ہیں تو ساتھ ہی غموں،

نفرت، مشکلات، بیماریوں اور ناامیدی کے درد بھی وا کرتے جاتے ہیں - یوں شاعر کی شاعری موضوعات کے اعتبار سے زندگی کا ایک حقیقی بیانیہ بن کر ابھر رہی ہے۔

ہم زندگی کی دوڑ میں پیچھے ہی رہ گئے
کیا کیجیے کہ دور ہمارا نہیں رہا

.....

ڈاکٹر طلعت شبیر کا موضوع انسان اور انسانیت ہے - یوں انسان سے جڑے ہر موضوع، ہر احساس، ہر نفسیاتی پہلو، ہر جذبے اور ہر خیال کو وہ ایک نئی تازگی بخش کر اس انداز میں پیش کر جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو خوشی کا افراطی احساس تو ہوتا ہے مگر منفی رویوں کے مطالعہ سے احساسِ رحم اور ہمدردانہ رویہ پیدا ہونے کے بجائے اس جذبے کو بھی کائناتی حقیقت مان کر گلے لگانے کو جی چاہتا ہے۔ یہ مہارتیں چند ہی شعرا کے حصے میں آتی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی، الطاف حسین حالی اور بیسویں صدی کے بیسیوں شعرا نے کمزور طبقے کی محرومی، مایوسی، نا امیدی، جبر، استحصال، ظلم اور اس سب پر بے حسی کا ماتم بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر طلعت شبیر کے ہاں بھی یہ موضوعات ہیں۔ مگر پرانی لکیر پیٹنے کے مقابلے میں ڈاکٹر طلعت شبیر نے ان غموں کو نہ صرف گوارہ کرنے کی جسارت کی ہے، بلکہ ان کے حل کے لیے انقلابی آواز بلند کی ہے اور در انصاف پر دستک دینے کی کوشش بھی کی ہے۔ اور اس احساس پر اکتفا کرنے کا درس دیا ہے کہ کم از کم اپنی ازلی بے حسی کی چادر کو تو اتار پھینکا جائے۔ ڈاکٹر موصوف اصل میں بے حسی کو تمام جرائم سے بڑھ کر جرم قرار دیتے ہیں اور جرائم کے خاتمے کے لیے اولین قدم بے حسی کا خاتمہ ہے۔

انگلیاں کٹ گئیں فنکار کی خاموشی سے
کیا سنا ہے کبھی تم نے کسی معمار کا دکھ

.....

غزلوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر طلعت شبیر نے نظمیں بھی تحریر کی ہیں اور نثری نظموں کا انمول و نایاب خزینہ بھی پیش کیا ہے۔ نظموں میں ڈاکٹر صاحب کا انداز کافی حد تک رومانوی ہے۔ مگر وہ سماجیات پر گہری نظر رکھتے ہوئے اس سماج کو اپنا موضوع بناتے ہیں جس نے انسان کو اپنے جبر کا تابع بنایا ہوا ہے اپنے حساس دل سے اس جبر کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ مگر اپنے قلم کو ہرگز اپنے جذبات کا تابع نہیں رکھتے، بلکہ اپنے فن کے معتدلانہ رویے سے غیر جانبدار رہتے ہوئے ایک ایسا متوازن نقشہ کھینچتے ہیں کہ قارئین محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اپنی نوائے درد کو شاعر نے اپنے اشعار میں ڈھال کر قارئین کے سامنے رکھا ہے۔ یہ حساس دل کے گداز ترانے ہیں جو خون کی روشنائی سے تحریر ہوتے ہیں اور قارئین کے دل کو بھی نرم و گداز کرتے جاتے ہیں۔

شہر بیدار ہوا چاہتا ہے
کچھ تو اس بار ہوا چاہتا ہے

.....

اک مدت سے تیرے تابع تھے
اب کے انکار ہوا چاہتا ہے

☆☆☆☆☆

نفیری.....ایک اہم کتاب

خالد اقبال یاسر اردو شعر و ادب کا اہم ترین نام ہیں۔ اس کی ایک وجہ ان کی بے مثال شاعری ہے۔ لیکن ایک عمدہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ادیب، نقاد، محقق، اقبال شناس اور مترجم کے طور پر بھی اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بہترین انتظامی صلاحیتیں بھی رکھتے ہیں۔ اپنی مسلسل محنت اور ریاضت کی وجہ سے انھوں نے کئی علمی و ادبی اداروں میں نہایت عمدگی سے خدمات سر انجام دی ہیں۔ یاسر صاحب کی شاعری کے موضوعات منفرد اور عام روش سے ہٹ کر ہیں۔ ان کی شاعری میں عصر حاضر کے مسائل، تاریخ، جنگ، امن، مذہب، معاشرتی ناہمواریوں کی نشاندھی، تیر، تلوار، شاہی ماحول کی منظر کشی، سیاست، تصوف اور دیگر بہت سے موضوعات کو انتہائی خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کی تازہ شعری کاوش نفیری بھی اسی معیار کا تسلسل ہے، جو پچھلے کئی برسوں سے ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ یاسر صاحب کی ایک پہچان مزاحمتی شاعر کی بھی ہے۔ انھوں نے کتاب کے فلیپ پر مزاحمت کا مفہوم انتہائی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں، مزاحمت، دفاع، ردعمل انسانی فطرت میں شامل ہیں۔ مزاحمت کا منبع انسان دوستی ہے۔ مزاحمت انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی۔ انسان کی اپنے آپ سے جنگ بھی مزاحمت کا ہی ایک پہلو ہے۔ ہمارے ہاں مزاحمت کا مطلب آمریت اور اقتدار کے کروفر اور رعونت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا ہے۔ بلکہ محض نفرت سے آگے بڑھ کر قلمی یلغار کے کارزار میں رہنا ہے۔ جو اس رعونت کے خلاف ہو۔ اس رعونت کو تسلیم کئے جانے کا غم، فرعونیت کے تسلسل میں ظلم کی بالادستی، من مانی، حقوق کی پامالی، انصاف کی روگردانی، دوں پروری اور صلاحیت کی بے وقعتی کا رنج اور اس رنج سے پھوٹنے والے غصے سے مزاحمتی شاعری جنم لیتی ہے۔ جسے بالا دستی طبقے بغاوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ حقوق کی پامالی، زوال اقدار کا نوحہ اور ان کی بحالی کے لئے مزاحمت اور معاونت کا جذبہ ہمارے عہد کی ہی نہیں ہر عہد کی شاعری کا نمایاں رجحان رہا ہے اور رہے گا۔،،

مزاحمت کو اتنے وسیع انداز میں شاید ہی کسی نے بیان کیا ہو۔ اب آیئے نفیری کا جستہ جستہ جائزہ لیتے ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر فرحت جبیں ورک نے بعنوان ---- نفیری، بھاؤ اور سبھاؤ کے تناظر میں---- لکھا ہے۔ کتاب کا آغاز حمدیہ شاعری

محمد نوید مرزا

سے ہوتا ہے۔ شاعر اپنے رب کے حضور دعائیہ انداز میں التجا کرتا ہے۔ آپ بھی پڑھیں۔۔۔

خضر جتنی زندگی ہو حمد میں تیری بسر
تو بنا بھی دے قلم اس دھر کے سارے شجر
تختیاں ہو جائیں میری ان گنت کوہ و قمر
صرف ہوں بحروں بحیروں کی دواتیں بھی اگر
مجھ سے رہ جائے گی پھر بھی تیری مدحت میں کسر
خشک ہوتی ہی چلی جائے گی کلک ترہتر

.....

اس کے بعد عقیدت و احترام کی خوشبو سے لبریز نعتیں شروع ہوتی ہیں۔ نعت گوئی میں بھی یاسر صاحب کا انداز قدرے مختلف ہے، چند شعر دیکھیں۔۔۔

نڈر بناتی ہے امتی کو تری سیادت
تری اماں ہے مجھے میسر تو خوف کیسا

.....

خاک جو تیرے پاؤں سے جھڑتی
دفن میں اس کی گور میں ہوتا

.....

آپ نے میری شفاعت میں کمی کوئی نہ کی
میں نے بھی جذبہء بیدار سے آمین کہا

.....

کبھی اپنے مکے مدینے بلا
کسی بھی مبارک مہینے بلا

.....

اس کے بعد غزل کا سفر شروع ہوتا ہے۔ نفیری کی غزلیں آج کی جدید شاعری سے ہم آہنگ ہیں۔ یاسر صاحب ایک وسیع مطالعہ رکھنے والے انسان ہیں، جس کا عکس ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ وہ نہ صرف پختہ فکر شاعر ہیں بلکہ جدید سوچ اور نئے نظریات کو بھی اپنی شاعری میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ان کے پاس موضوعات کی کمی نہیں۔ تاہم ان کے زیادہ تر شعر عام قاری کی سوچ سے کہیں بلند ہیں۔ ان کی فن کارانہ چابک دستی، تخلیقی مہارت اور مصرعوں کی دروبست انھیں اپنے عہد کے کئی شعرا سے ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ بقول ڈاکٹر فرحت جبیں ورک،،

بااعتبار مجموعی ،،نفیری،، کا تخلیقی منظر نامہ واقعات یا کرداری تلمیحات پر اپنا انحصار روا رکھنے کے بجائے، لفظی علائم پر اپنی بنیاد استوار کرتا ہے اور یہ لفظی علائم بالعموم داستانوی عناصر۔۔۔ فطرت سے ارتباط اور حسیاتی اعتبار سے فرد کی لاحاصلی، کم مائیگی، بے معنویت، شکستگی، یاس، بے یقینی، بے حسی، اضطراب، منتشر الخیالی اور عدم اطمینانی کے ادراکی و حسیاتی خدوخال سے مزین ہو کر سامنے آتے ہیں،،

اس رائے کی روشنی میں یاسر صاحب کے موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں وہ نت نئی راہیں تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یاسر صاحب اس معاشرے کے حساس ترین فرد ہیں۔ وہ معاشرے میں ہونے والی نا انصافیوں، ناہمواریوں، عدم مساوات اور سسٹم کی خرابی کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کرتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ دکھی دل سے کہتے ہیں۔۔۔

سکون کم کم ہے عام دکھ ہے
خوشی ہے وقتی مدام دکھ ہے

.....

ستم پہ آزردہ ہے ستم گر
ستم رسیدو ! تمام دکھ ہے

.....

چلے تو مشکل رکے تو مشکل
گلا سڑا یہ نظام دکھ ہے

.....

نیلام عدل جاری ، فریاد بھی تجارت
ظلم و ستم بھی سودا ، امداد بھی تجارت

.....

یاسر صاحب اپنی شاعری میں کئی مواقع پر جرأت مندی کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ سیاست دانوں کے حربوں، چالاکیوں اور لوٹ مار کرنے والے مافیا سے پوری طرح واقف ہیں۔ اپنی طویل نظم سیاست نامہ میں لکھتے ہیں۔۔۔

وزارت کی، صدارت کی سیاست
تمنائے حکومت کی سیاست
بہت امریکیوں سے مصلحت کی
چلی ہے پھر بھی بھارت کی سیاست
وہی درباں وہی دربار داری
وہی صاحب سلامت کی سیاست

.....

آج کے سیاسی، سماجی، معاشی اور شعری منظر نامے پر بھی اس شعری مجموعے میں بہت سی غزلیں موجود ہیں۔ جن میں ایک ہی قافیے اور ردیف پر مشتمل غزلیں کمال کی ہیں، آیئے چند شعر دیکھیں۔۔۔

کوئی بھی منحرف نہیں ، در مختلف نہیں
جتنے بھی کورنش میں ہیں سر مختلف نہیں

ایسا نہ ہو کہیں کہ سبھی ہوں ملے ہوئے
مخبر ہے کوئی اور خبر مختلف نہیں

کلفی اسی طرح کی ہے کلبوت اور ہے
سلطان کی کلاہ کے پر مختلف نہیں

تختہ ہمیں بنائے رکھا مشق کے لئے
اب تو رواں ہے ہاتھ ہنر مختلف نہیں

.....

16 دسمبر سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے بھی ایک غزل شامل ہے۔ اسی تاریخ کو ہم ایک اور سانحے سے بھی گذرے تھے، جب پشاور میں دہشت گردوں نے آرمی پبلک سکول پر حملہ کر کے سکول کے بچوں، اساتذہ اور عملے کے 141 بچوں کو شہید کر دیا تھا۔ میں نے اس سانحے کے بعد ایک ناول اور کئی ایک نظمیں لکھی تھیں۔ یاسر صاحب نے بھی اس سانحے کی یاد میں شاعری کی ہے۔ انھوں نے معصوم بچوں کی یاد میں دل کی گہرائیوں اور آنسوؤں کی تپش کے زیر اثر شعر لکھے ہیں۔ ملاحظہ کریں۔۔۔

ابھی تو توتلی زبان میں بولنے کی عمر تھی
یونہی بلاسبب اچھلنے کودنے کی عمر تھی

نئی نئی شرارتیں جہاں بھی جب بھی جی کرے
بڑے بڑوں کو بے ارادہ چھیڑنے کی عمر تھی

یہ گولیوں کی باڑ درمیان آ گئی کہاں
یہ بارشوں کی بلندیوں میں بھیگنے کی عمر تھی

سلا دیا کسی نے نیند سے نہ اٹھنے کے لئے
خوشی خوشی تمھارے سونے جاگنے کی عمر تھی

کوئی ہمارے بچپنے دوبارہ چھین لے گیا
تمھارے چہروں میں ہمارے بچپنے کی عمر تھی

.....

یوم دفاع یعنی چھ ستمبر کے حوالے سے بھی تین شاندار غزلیں نفیری کا حصہ ہیں۔ کتاب کے آخر ایک طویل سہرا شامل ہے، جو انھوں نے اپنے شایان کے لئے تحریر کیا ہے۔ یوں نفیری اپنے دامن میں زندگی کے نشیب و فراز، حقائق کی تلخیاں، عصر حاضر کے مسائل اور کئی سلگتے ہوئے سوالات کے ساتھ پوری شان و شوکت کے ساتھ دنیائے ادب میں پہلا جگمگا رہی ہے۔ یاسر صاحب کو مبارک باد، ویل ڈن

☆☆☆☆☆☆

مادشگوفے [محترم منیر نیازی]

منیر نیازی صاحب سے میرا تعلق احمد ندیم قاسمی اور اُن کے ادبی جریدے 'فنون' کے حوالے سے تھا۔ اگرچہ نیازی صاحب کبھی کبھار ہی ''فنون'' تشریف لاتے تھے۔ مگر ''فنون'' اور ادبی خبریں اُن تک پہنچانا میرا کام تھا، نیازی صاحب بنیادی طور پر سمٹ کر رہنے والے آدمی تھے۔ بہت مقبول اور محبوب ہونے کے باوجود لوگوں سے ملنے اور ادبی تقریبات میں آنے جانے سے گریز کرتے تھے، اور جب کبھی ان کی مستی کے بارے میں پوچھا جاتا تو فرماتے، یار میں ''لوگاں نوں فیس نہیں کرسکدا، اس واسطے وچوں غائب ہون دا اک اوہی رستہ اے''

منیر نیازی جتنا لوگوں سے دور ہوتے تھے اتنا ہی لوگ ان کے قریب ہونے کے خواہش مند تھے۔ منیر نیازی کا سراپا پُرکشش تھا، لمبا قد، شلوار قمیض اور واسکوٹ کے ساتھ پاؤں میں کبھی سادہ اور کبھی تلے دار کھسہ ان پر جچتا تھا۔ کسی بھی ادبی فنکشن میں ڈرے ڈرے انداز میں آنا، صدر یا مہمان خصوصی کی کرسی پر بیٹھنا اور پھر گھبرائے گھبرائے ادھر ادھر دیکھنا جیسے کچھ تلاش کر رہے ہوں، نیازی صاحب کا خاص انداز تھا۔ ادبی تقریبات کے علاوہ اگر کبھی کسی ادبی محفل میں جاتے تو وہ احمد ندیم قاسمی کی محفل ہوتی۔ مشاعرے میں بھی وہ تکیے سے ٹیک لگائے نظریں جھکائے بیٹھے رہتے، اور بہت کم کسی شعر پر داد دیتے، مگر اپنی باری آنے پر ان کی خواہش ہوتی کے اب لوگ ان کو دیکھیں بھی اور توجہ کے ساتھ داد بھی دیں، اُسی طرح ریڈیو کے ایک مشاعرے میں خالد احمد صاحب نے ایک شرارت کی اور منیر نیازی صاحب کے آنے سے پہلے انھوں نے پروڈیوسر ارشاد حسین کے کمرے میں ہی ہر آنے والے شاعر سے کہ دیا کہ منیر نیازی صاحب کی باری پر سب نظریں نیچی رکھیں اور داد بھی نہ دیں پھر جب مشاعرے کے صدر منیر نیازی کی باری پر مائیک ان کے سامنے آیا، اور نیازی صاحب نے غزل شروع کی تو سٹوڈیو میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ نیازی صاحب نے دو تین بار مطلع پڑھا، مگر شعرا کی خاموشی اور نظروں کے نیچے رہنے سے نیازی صاحب کو بہت پریشانی ہوئی، کچھ

اعجاز رضوی

دیر تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھتے رہے پھر مخاطب ہوئے 'اوئے خالد احمد توں باز آجا' نیازی صاحب کا یہ کہنا تھا کہ پہلے پروڈیوسر کا قہقہہ بلند ہوا پھر تمام شعرا کرام نے قہقہہ لگایا اور یہ بات کھل گئی کہ یہ خالد احمد کی ایک شرارت تھی۔

پھر نیازی صاحب نے کلام سنایا اور بھرپور داد وصول کی۔ اسی طرح ایک مشاعرہ اوپن ایئر تھیٹر میں ہو رہا تھا اور لوگ شعرا کرام کو ہوٹ کرنے کے موڈ میں بیٹھے تھے، اور خاص طور پر نوجوانوں کی ایک ٹولی اس کام میں پیش پیش تھی، ابتدائی شعرا کے ساتھ ہونے والے سلوک کو دیکھتے ہوئے نیازی صاحب نے اشارہ کرتے ہوئے مجھے اپنے پاس بلایا، اور قریب ہی بیٹھنے کو کہا، پھر قریب ہوتے ہوئے فرمایا،

مولوی جے مینوں وی لالچی ہوتراں نے ہوٹ کیتا تے فیر کی ہووے گا،

میں نے بڑے اعتماد سے کہا' سر میں ہوٹ کرن والے منڈے دے منہ تے یہ مٹھی سونف والا پیالہ مار دینا اے'

نیازی صاحب نے یہ الفاظ سنے تو مسکرائے پھر اکڑ کر تکیے سے ٹیک لگا کر بولے، لے فیر جے تینوں ہوٹ کیتا تے میں ایتھوں ڈانگ مارنی اے تے تو مینوں پھڑنا نہیں۔ شکر ادا کرنے کے بعد نیازی صاحب ذہنی طور پر ہوٹ ہونے کے لیے تیار ہونے لگے اس دوران مجھ سمیت بہت سے شعرا نے کلام سنایا، واہ واہ ہوتی رہی، پھر نیازی صاحب کی باری آئی۔

انھوں نے بہت سا کلام سنایا، لوگوں نے توجہ سے سنا اور خوب داد دی، پھر احمد ندیم قاسمی صاحب نے کلام سنایا، اور مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔ باہر نکلتے ہوئے نیازی صاحب نے فرمایا، یار تیری گل نے مینوں بڑا حوصلہ دتا بڑی بچت ہو گئی لالچی ہوٹر میرے پڑھن تو پہلاں ای چلے گئے، ورنہ اج بڑا خون خرابا ہونا سی،

انہی دنوں اتفاق سے دو تین مشاعرے چیچہ میں ہوئے، اور اتفاق سے ہی دونوں تینوں مشاعرے میں جاوید صدیق بھٹی نے ہمیں بلایا، تیسرے مشاعرے میں نیازی صاحب نے اپنے خاص پراسرار انداز میں میرے قریب ہوتے ہوئے فرمایا۔ یار، جاوید صدیق بھٹی مینوں بار بار بلاندا اے مینوں اے پوپ پال تے نئیں سمجھ دا، ان دونوں مشاعرے کے لیے جاوید صدیق بھٹی نے پہلے منیر نیازی صاحب کو ٹاؤن شپ سے لیا پھر مجھے جوہر ٹاؤن سے بٹھایا اور راستے میں چند اور شاعروں کو گاڑی میں ٹھونس کر مشاعرہ گاہ لایا تو نیازی صاحب نے فرمایا، یار جاوید بھٹی تیرے واسطے اک مشورہ اے توں گڈی چھڈ کے ٹرک چلانا شروع دے تے جاوید ٹرکاں والا دے ناں تو شاعری کریا کر،

ایک بار نیازی صاحب سخت بیمار ہوئے اور ہسپتال میں داخل ہو گئے احمد ندیم قاسمی صاحب نے جب یہ سنا کہ نیازی صاحب ہسپتال میں داخل ہیں تو انھوں نے مجھے پابند کیا کہ شام کو نیازی صاحب سے ملنے

ہسپتال جانا ہے۔ آپ تیار رہیں، یوں ہم ہسپتال پہنچ گئے۔ میں وارڈ میں داخل ہوا اور جلدی جلدی نیازی صاحب تک پہنچا کہ انھیں آگاہ کروں کہ ندیم صاحب بھی آ رہے ہیں۔ میں نیازی صاحب کے قریب پہنچا تو دیکھا وہ کروٹ لیے آرام فرما رہے ہیں میں نے سلام کیا، تو انھوں نے چونک کر دیکھا پھر اُٹھ کر بیٹھنے لگے تو میں نے حال چال پوچھا، نیازی صاحب نے بات چیت کی اور فرمایا، تیرے استاد دا کی حال اے میں نے عرض کی، اوہ وی آئے نے، اتنے دیر میں ندیم صاحب آ چکے تھے نیازی صاحب نے انھیں دیکھا تو باقاعدہ کھڑے ہونے لگے ندیم صاحب نے انھیں پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا اور حال چال پوچھا۔ ندیم صاحب کو دیکھ کر ایک ڈاکٹر آ گیا اور ندیم صاحب سے ملنے لگا، اسی دوران منیر نیازی صاحب نے فرمایا: 'اوے یار مینوں پتہ ہی نہیں چلیا، لگدا اے احمد ندیم قاسمی کسی ڈاکٹر دے روپ وچ اندر آیا اے۔

منیر نیازی صاحب جن احباب سے رابطے میں رہتے وہ آپ جناب صاحب نہیں ہوتے تھے، صرف اُن کے دوست تھے اور وہ اُن سے یوں ہی مخاطب ہوتے تھے کہ عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کے نیازی صاحب صرف مخاطب ہی نہیں کرتے تھے بلکہ باقاعدہ چہکتے بھی تھے،

ایک دن میں اپنی آفس کنٹین سے باہر نکلا تو دیکھا، منیر نیازی صاحب اے جی آفس سٹاپ پر پریشان حال ویگن کا انتظار کر رہے ہیں، میں نے قریب جا کر سلام کیا ہاتھ چومے اور یہاں موجودگی کی وجہ پوچھی تو بولے میں کار جانا اے پر اے رکشے والا کرایہ دے ناں تے اپنی بیٹی دا پورا جہیز منگدا اے، تے ویگن میرے ہتھ نہیں آ رہی، میں نے اسٹینڈ سے موٹر سائیکل نکالی نیازی صاحب کو بٹھایا اور ٹاؤن شپ کے لیے روانہ ہو گیا، سارے رستے نیازی صاحب باتیں کرتے رہے، اور جب میں کچھ کہنے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھتا تو نیازی صاحب گھبرا جاتے، جب دو تین بار ایسا ہوا تو منیر نیازی صاحب بولے یار مولوی توں سمجھ تیرے پیچھے تیرا پتر بیٹھا اے مینوں جواب نہ دے۔ اے نہ ہووے اسی دونوں اللہ نوں جواب دین واسطے اوتے چلے جائیے۔

بات مکمل کرنے کے بعد نیازی صاحب نے میری کمر پر دو دھپ لگائے۔ اور ہنسنے لگے یوں ہم کچھ دیر میں نیازی صاحب کے گھر ٹاؤن شپ پہنچ گئے، میں نے گیٹ پر نیازی صاحب کو اتارا پھر خود موٹر سائیکل سے اترا، انھیں سلام کیا ہاتھ چومے اور اجازت چاہی۔ تو نیازی صاحب نے ذرا بلند آواز میں فرمایا، اجازت اے، پھر ذرا رک کر بڑی شفقت سے فرمایا "یار مولوی توں جدوں میرے کار آنا اے مینوں لگدا اے مینوں مسلمان کراں آیا اے" اس دن سے لے کر آج تک میں اُس فخر کی موج میں پھر رہا ہوں کہ میں نے جناب منیر نیازی جیسے سچے شاعر اور کھرے انسان کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہے۔

☆☆☆☆☆

اِسے کیا نام دیں

اِسے کیا نام دیں بولو
کہ تم
اُس نرسری کا
ذکر کرنے سے گریزاں ہو
پنپتی ہے پنیری
جس جگہ مسموم پودوں کی
اوران مذموم باغوں کی
کہانی سے بھی
کترا کر گزرتے ہو
جو اِن پودوں کو
تن آور درختوں میں بدلتے ہیں
مگر باغوں کے مالک
جب خود اِن کی
سرکش و آزاد شاخیں کاٹنے
یا پھر جڑوں تک کھود کر
پورا جلا دینے
نشاں تک بھی مٹا دینے
کے رستے ڈھونڈتے ہیں
تو
تم ان کی ہم نوائی میں
قلم کے نو بہ نو گُر آزماتے ہو
تمنا کی منڈیروں پر
دیے جب جلنے لگتے ہیں
مفاد و مصلحت کے
نحس جھونکوں سے بجھاتے ہو
اوراس پر بھی
نڈر بے باک اہلِ حرف کہلاتے ہو

جلیل عالی

دعا

مرے مالک مجھے بھی ہو عطا اب آگہی ایسی
کہ تو راضی رہے مجھ سے بسر ہو زندگی ایسی

تجھے پہچان کر تیری عبادت کا صلہ پاؤں
مرے دل میں تو بھر دے اے خدا اب روشنی ایسی

حقائق منکشف ہوں بندۂ ناچیز پر یوں بھی
کہ حاصل ہو رضا تیری کروں میں بندگی ایسی

مجھے میخانۂ توحید میں لے چل مرے ہمدم!
مئے عرفاں ملے مجھکو رہے نہ بے کلی ایسی

کروں میں شکر کا سجدہ کہ سر اٹھے نہ سجدے سے
کہ پیدا ہو مرے اللہ دل میں عاجزی ایسی

دلوں میں بھر گئی گردِ کدورت خالقِ اکبر!
کہ چہروں پر کہاں تحریر پائی بے رخی ایسی

حسن عسکری کاظمی

نظم

صفدر صدیق رضی

وہاں سب اجنبی ہونگے

مسلسل ڈھونڈتے رہ جائیں گے

قوم اپنے رہبر کو

کوئی امت پیمبر کو

کئی ماں باپ بچوں کو

کوئی بھائی بہن کو

دوست یاروں کو

محبت کرنے والے اپنے پیاروں کو

کوئی بھی مل نہ پائے گا

پر اس عالم میں بھی

پہچان کر تجھکو

میں تیرا ہاتھ بڑھ کر تھام لوں گا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دائرہ دائرہ قوسوں میں گھرا ہوں کب سے

کتنے ڈورے ہیں کہ اُلجھے ہیں مری آنکھوں سے

پتھر چاٹنے والے کا آٹوگراف

خوابوں کے اَن چھوئے سے گالے
اس سرمائی بالکنی میں
اپنے ادھورے پن کو چُھپاتے
پرچم
دھوپ کی راہ میں حائل ہونے سے بھی گریزاں

جانے کیا ہے! جس سے
بھربھر بالٹیاں لاتی
الہڑ، شوخ حیاتی
زرد، سفید مکانوں والی گلیوں سے
گزرے جاتی ہے
بحر سے خارج گیت لہو کے
پشت پہ پانی کے ابھری کم زور نسیں
اور مستقبل اک پتھر ہے

پتھر چاٹنے والے کا اک آٹوگراف

دُور پہاڑی کی پتھریلی سانسوں کا احساس لیے
وہ تلخ ہَوا
جیسے نمک سے بوجھل ہے
روشنیاں بے معنی بیتی جاتی ہیں
اک بھرپور تھکن کے پار
نیند کو ٹھکرا دینے والے
متعدی اس خالی پن کو
قطرہ قطرہ
کوئی خواب کو سونپ رہا ہے
چھاؤں، سایہ ڈھونڈ رہی ہے
دھوپ، ہوائیں، ریت اور پانی
اک دوجے میں سماتے ہیں

سوچ رہا ہوں
اپنے ہاں
کیا وقت ہوا ہوگا
اب
جانے!

حامد یزدانی

خیر مقدم

اس بستی سے اُس بستی تک
اِس آنگن سے اُس آنگن تک
پھولوں سے ڈھکا اک رستہ ہے،
جس کے اطراف استادہ شجر،
پتّوں کی دوشالائیں لیے
خوشبو سے اَٹی فضائیں لیے!
یخ بستہ، گداز ہوائیں لیے
شبنم سے بُنی مالائیں لیے
تاروں کی کاہکشائیں لیے،
ساون کی دھنک قبائیں لیے،
تتلی کی شوخ ادائیں لیے،
گہری سُرمئی گھٹائیں لیے،
خوابوں میں رنگی ردائیں لیے،
سندر سندر آشائیں لیے،
کب سے بے انت دعائیں لیے
تمھیں ڈھونڈتے ہیں
تمھیں پوچھتے ہیں

میں تمھیں بشارت دیتا ہوں
اس نیند نگر میں انیسِ جان!
تم اُترتے تو،
خوابیدہ جذبے اِذنِ کلامی دیں گے تمھیں
اس راہ گزر سے انیسِ جاں!
تم گزرے تو سب لمحے سلامی دیں گے تمھیں

محمد انیس انصاری

یقین سے پھوٹتے لمحے کا ادراک [فلسطین کے تناظر میں]

نثار ترابی

اُڑان قاتل ہے یہ سفر تو اسی میں اِک دن
عذاب راتوں کے قافلوں کو صبحِ منزل اُجال لے گی
تلاشِ منزل کی اِس لگن میں، اگرچہ پاؤں پہ آبلے ہیں
مگر یقیں ہے، مجھے یقیں ہے
کہ حشر تک بھی وہ ساری آنکھیں کھلی رہیں گی
جنھیں سحر کی کسی تمنا نے رت جگوں کا ملال بخشا
مجھے یقیں ہے، مجھے یقیں ہے
یہ خوں کے دریا رواں نہ ہوں گے
دیارِ اقدس کے زرد آنگن میں بسنے والی ماؤں
کی لوریوں کو زباں ملے گی
مجھے یقیں ہے
یہ قتل گاہوں کے خونی منظر، جوان لاشے
یہ بین کرتے سلگتے آنچل، دریدہ دامن، یہ جلتے غنچے
نئے سویرے کی تاب ناکی، اُفق پہ لائیں گے بن کے سورج
مجھے یقیں ہے اے ارضِ اقدس!
یہ ساری کوفی و شامی چالیں، عدو کے سارے طلسم خانے
ستم کے سارے یزید منظر
نہیں رہے ہیں، نہیں رہیں گے نہیں رہیں گے
بلند ہوگا، حسینیؑ پرچم
مجھے یقیں ہے
قفس سے اُبھرے گا ایک سورج
کہ جس کے سر پر سنہری کرنوں کا تاج ہوگا
رہائی پائیں گے قید موسم حسیں بہاروں کا راج ہوگا
مجھے یقیں ہے، مجھے یقیں ہے، گھڑی قریں ہے
گلِ رہائی کھلے گا جس پر، یہی زمیں ہے
یہ کہہ رہے ہیں جوان جذبے
نشانِ منزل یہیں کہیں ہے
مجھے یقیں ہے، مجھے یقیں ہے

میں ایک عورت

میں وہ عطائے کریم رب ہوں
بنی جو زینت زماں مکاں کی
خدا نے مجھ کو شعور بخشا
میں ذہن اطلس کی مالکہ ہوں
میں باہنر ہوں، میں باوفا ہوں
ہوائیں لیتی ہیں عطر مجھ سے
میں صحن گلشن کی کونپلہ ہوں
میں وہ ہوں جاناں کہ آسمان پہ اڑان بھر کر
کہیں جو ابر رواں کو چھیڑا
ستارے چونکے
قمر بھی مچلا
یہ میں ہوں جس نے پہاڑ پاٹے
بلندیاں ایورسٹ کی چھو کر
وطن کا چھندا میں گاڑھ آئی
سوال لای
کہاں ہے عورت کسی سے کم تر؟؟
کہاں ہے احقر؟
یہ میں ہوں جس نے
کسی بہت کم سنی میں رہ کر
علوم نو میں عروج پایا
کہ نام ارفع کریم میرا
مگر میں 11 برس کے سن میں
تمہاری دنیا سے جا چکی ہوں
کمال شہرت میں پا چکی ہوں
ادھر جو دیکھو تو کھیل گھر میں
کہیں میں بسمہ بنی کھڑی ہوں
کہ لمبی دوڑوں میں نام میرا
زقند لگاتی ہوں پہلی صف میں
میں سب سے آگے کھلاڑیوں میں

مگر ابھی داستان باقی
میرے ہی اندر کسان عورت
یہ اینٹیں ڈھوتی
یہ گھر بناتی
سحاب عورت

کمال عورت
خدایا مجھ کو سمبھال رکھنا
کہیں کسی نعرہ خوشنما کے
نحس اثر میں نہ آنے پاوں
میں باہنر ہوں ہنر میں رکھنا
میں باحیا ہوں، حیا میں رکھنا

فرخندہ شمیم

دنیادار

آنکھوں میں
جلوہ کناں چاہت
اِخلاص کی ساری حدت
اِحساس کا تمام وزن
جذبوں کے سارے پرتو
جب میں نے
جنون کے میزان پر رکھے
تو
تمہارا پلڑا بھاری تھا
کہ تم نے ٹوٹ کر محبت کی
اور میں
احتیاط کے کرب میں اُلجھا
صرف دُنیاداری کر سکا

طلعت شبیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اَے دَستِ ہُنر، تُو نے فقط لفظ جَڑے ہیں
سو پُھول پسِ حرف، تہِ سطر پڑے ہیں

محسوسات کی نیرنگی!

ان لمحوں پہ کتنا الگ سا پیار آتا ہے---
جب ذہن و دل تمھاری سمت سے کھینچ کر
کسی اور سمت لگانے کی سعی کی جاتی ہے---
اور ان لمحوں پہ اس سے بھی بڑھ کر پیار آتا ہے---
جب ذہن و دل پھر بھی تمھاری سمت ہی لگے رہتے ہیں---
تم اس وقت کیسے بول رہی ہوگی---
کیسے لہجے کی کوملتا سے مس ہونے کی خوشی میں---

لفظ قطار اندر قطار بے تاب کھڑے ہوں گے---

بات کرتے ہوئے کیسے آنکھیں جھکی ہوں گی---
اور کائنات نے کیسے اس لمحے کی خوب صورتی پر---
آسودگی بھرا سانس لیا ہوگا---
کیسے بے خیالی میں پنسل انگلیوں تک آئی ہوگی---
اور وقت اپنی رفتار سے الگ ہو کر تصویر ہو گیا ہوگا
محبت بس محسوسات کی نیرنگی ہے---
اور میرے محسوسات کے ہر مسام پر
تمھارا وجود رکھا ہے---
اس سے زیادہ قربت بھلا کیسے ممکن ہے

خالد ندیم شانی

گلوبل ورلڈ کے کمبل میں

کوئی تو
لپیٹ رہا ہے
گلوبل ورلڈ کا کمبل
کہیں سے
نئے زمانے
فضا میں
اجنبی سی آہٹ
ہمارے دل، ذہنوں میں خدشے گھولتی ہے
ہم جو
روایت اور اقدار سے جڑے
معمولی ذرات سے بھی کمتر
اپنے ہونے کی بے سود گواہی سے منحرف
نجانے کتنے تجربات
سینوں میں چھپائے
مسلسل رائیگانی کے جلو میں چل رہے ہیں
ابھی انسان بننے سے کوسوں دُور ہیں
یہ دُنیا
ہر لمحہ تبدیل ہونے کی کہانی ہے
یہاں رنگوں کی بارش
پھول موسم
محبت کی ڈائری.....سب بوسیدہ ہے
یہاں پر لوگ اور اُن کی ضرورت کا فسانہ ہے
تبھی تو مختلف
حیرت کدے
ہمیں ایجادات کے بلیک ہول میں گمراہ کرتے ہیں
انسانوں نے بازار سے زیادہ
اور قیمت سے آگے کچھ نہیں دیکھا
ہر کسی کا اپنا خدا ہے
جیسے ہر شخص کا خود ساختہ جنوں
تخیل کے موم سے جڑا
صحرائی ریت پہ عظمت کے نشاں ڈھونڈتا ہے

امجد بابر

اژدھا

میں وہ نہیں صغیر، میں جو تھا
بدل گیا
یہ کیسی شکل ہے
میں جس میں ڈھل گیا
کہ میرے خدوخال ہیں،
وہی جو تھے
مگر مرا نظام انہضام اب بدل گیا

میں اپنے وقت کا ہوں کوئی اژدھا
اگر نہیں تو گزرے وقت کا
میں کوئی ڈائنوسار ہوں

میں دشت میں لگے ہوئے
اک ایک پیڑ کی ہر ایک شاخ تک کو کھا گیا
پیٹ پھر نہیں بھرا
تو کوئلے کی کان بھی
جو راہ میں پڑی ہر اک چٹان بھی
چبا گیا

ہزار ہا جتن سے بھی
بھوک جب نہیں مٹی
تو ایک دن
میں خود ہی اپنے آپ کو نگل گیا

صغیر احمد صغیر

میں زندگی ہوں

میں کہہ رہی ہوں
مجھے نہ مارو
میں زندگی ہوں
مسافتوں کی میں دھول مٹی سے
اٹ گئی ہوں
میں مر رہی ہوں
مگر تھا عزم صمیم میرا
کہ منزلوں تک ہے
مجھ کو جانا
سو عزم و ہمت سے سوئے منزل
میں جا رہی ہوں
مجھے نہ روکو
کہ مجھ کو شاید
عداوتوں سے محبتیں ہیں
ہے شدتوں سے نباہ میرا
یہ غم ہے میرا
کہ نفرتوں میں گھری ہوئی ہوں
میں کہہ رہی ہوں
مجھے نہ مارو
میں زندگی ہوں
اگر کسی کو گمان گزرے
کہ میرے نقش قدم پہ چل کے
مسافتوں کے وہ زخم سہہ کے
نظام ہستی کو مجھ سے بہتر چلا سکے گا
تو شوق اپنا وہ پورا کر لے
مگر میں پھر بھی یہ کہہ رہی ہوں
مجھے نہ مارو
مجھے نہ مارو
میں زندگی ہوں
میں مر رہی ہوں

ثمینہ سیّد

بات افسوس کی ہے دکھ کی بھی

بات افسوس کی ہے دکھ کی بھی
شرم کی بھی ہے کچھ حیا کی بھی
بات حیرت کی بھی ہے سوچیں تو
زیب دیتا ہے کیا ہمیں بولو
چاند آتے نظر ہی رمضاں کا
مہ مبارک کا پاس کیا رکھا
روزہ داروں کو اس کے پیاروں کو
بیچ کے مہنگے داموں اشیا سب
عازم عمرہ آخری عشرے
کچھ تو خوف خدا کیا جائے
دھوکا خود کو نہ یوں دیا جائے
دل کی تسکین کا سنو ساماں
اس کے بندوں کے کام آنے میں
چین خدمت میں ہے عبادت میں
چین دنیا میں کب ہے دولت میں
زندگی میں سکوں ملے کیسے
لطف اندوز ہو نہیں سکتے
کون کہتا سکون پیسے میں
بھول بیٹھے ہو راہ ایسے میں
ہر گھڑی ایک سوچ ہی میں گم
پیسے کیسے کے چکروں میں تم

روزہ

بھوکا پیاسا ہی اک نہیں کافی
آنکھ بھی روزہ دار ہو تیری
کر تلاوت مگر سمجھ کے تو
صوم کیا فلسفہ ہے کیا اس کا
وہ مخاطب ہے تجھ سے قرآں میں
مت سنیں کان کچھ غلط صاحب
ہاتھ بھی روزہ دار ہوں تیرے
کر ملاوٹ نہ کوئی چیزوں میں
مہنگے داموں نہ بیچ، رب سے ڈر
پیدا اشیا کی یوں نہ قلت کر
وہ ہے حاضر بھی اور ناظر بھی
وہ تو باطن سے بھی ترے واقف
رحم کر خود پہ ہوش کر بندے
اپنی حد سے نہ تو گزر بندے

عاصم بخاری

۸ مارچ [خواتین کے عالمی دن کے موقع پر]

عظمیٰ نقوی

اپنے اجداد سے یہ بات نہ پوچھی میں نے
بنتِ حوّا سے یہ توقیر چھنی کب سے بھلا
بیچ چوراہوں میں عورت کی تذلیل کا جشن
ابنِ آدم کا یہ محبوب عمل کیوں ٹھہرا

اپنے اجداد سے یہ بات نہ پُوچھی میں نے
میرے ہونے کا زمانہ بھی کبھی آئے گا
میں اگر خواب بنوں، خواب کی تعبیر تو ہو
سر اُٹھا کے چلوں، فکر کی مشعل لے کر
کاسنی رنگ میرے جذبوں کی تصویر تو ہو

کاش مِل جائے کوئی راہبرِ نام و نسب
جو یہ بتلائے مجھے وجہِ کدورت کیا ہے
ابنِ آدم تُجھے عورت سے عداوت کیا ہے
میں جو آدم سے نہیں، میرا قبیلہ کیا ہے
اپنے اجداد سے یہ بات نہ پوچھی میں نے

نظم

غلام مرتضیٰ

ہو گئے دُنیا بھر سے مُخاطب
باتیں کرتے کرتے خود سے
جنگ کے میداں ظاہر و باطن
عُمر کٹی ہے لڑتے خُود سے
اپنا آپ ہی پاؤں سے روندا
آگے بڑھتے بڑھتے خُود سے
تا دَمِ مَرگ رہا ہے پردہ
کاش! کبھی ہم ملتے خُود سے
دِل کی بات بتا نہ پائے
عُمر گزاری ڈرتے خُود سے
سب نے کہا تو غُروب ہوئے ہو
سورج تھے تو ڈھلتے خُود سے

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

مجھے بسنے نہ دے خالد مگر دستک تو دینے دے
ترا دَر بن سکے گا میرا گھر آہستہ آہستہ

نثری نظم

تم سے بات کرنے کے بعد
دل بوجھل ہو گیا ہے
جانے تمھارے لہجے میں کیا تھا
میری روح تک گھائل ہوگئی
تم نے بات تو کی تھی
حال بھی پوچھا تھا
مگر پھر بھی
تمھارا لہجہ تمھارا نہیں تھا
دیکھو
لہجوں کے بھی موسم ہوتے ہیں
کبھی یہ موسم
خون میں حدت بھر دیتے ہیں
کبھی اکتاہٹ
کبھی سارا منظر
دھندلا ہو جاتا ہے
لہجوں کے بھی اپنے
موسم ہوتے ہیں

نائیلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد مجھے منظور نہ تھا جاں سے گزرنا
گھر بیٹھ رہا باندھ کے پیمانِ وفا میں

نثری نظم

وہ کبھی تو پاس آ کر
غم زندگی بھلا دے
جو مجھے یقین نہیں ہے
تو یقین ہی دلا دے
اسے پاس ہو وفا کا
تو رکھے کیوں پردہ داری
وہ جو گیت مٹ گئے ہیں
نئی دھن کوئی بنا دے
وہ جو حرف حرف بولے
اسے لفظ لفظ سمجھوں
وہ اشاروں کی زبان میں
مجھے حال دل بتا دے
کہاں اس سے ہو سکا ہے
کہاں اس سے ہو سکے گا
وہ میری کہانی مجھ کو
نئے نام سے سنا دے

شائستہ رمضان

نظم

میں بھی تو کسی کی بیٹی ہوں
برسوں سے کانٹوں پر لیٹی ہوں
ہے کوئی جو میرا ماں جایا
جو مجھ کو چھڑانے ہو آیا
کس تپتی ریت پر بیٹھی ہوں
اور ہاتھ اٹھائے رہتی ہوں
کوئی عدل کرے انصاف کرے
اور جھوٹ کا پردہ چاک کرے
یہی آس لگائے رہتی ہوں
ہر ضعف پہ ضعف میں سہتی ہوں
پر منہ سے کچھ نہ کہتی ہوں
بس سر کو جھکائے رہتی ہوں
اور وقت اٹھائے رہتی ہوں
اک بات ہمیشہ کہتی ہوں
میں بھی تو کسی کی بیٹی ہوں
برسوں سے کانٹوں پر لیٹی ہوں

Minhaj University Lahore

نعتیہ مشاعرہ بسلسلہ قومی ادبی نعت کانفرنس 2024

واجدا میر (لاہور)

حمیدہ شاہین

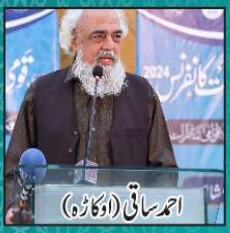
احمد ساقی (اوکاڑہ)

ظفر الحق چشتی

ڈاکٹر فخر الحق نوری

علی صابر رضوی (اوکاڑہ)

ڈاکٹر شبیر حسن

سلمان رسول

جماد نیازی

ڈاکٹر سرور حسین نقشبندی

ابو الحسن خاور

حسان المصطفیٰ (سیالکوٹ)

جناب گلزار بخاری، جناب امجد اسلام امجد

جناب گلزار بخاری، جناب محسن نقوی

جناب امجد اسلام امجد، جناب سعود عثمانی، جناب کرامت بخاری، جناب گلزار بخاری، جناب عمران نقوی

جناب گلزار بخاری گورنمنٹ کالج شیخوپورہ کی ایک تقریب میں